ISSN 0970-180

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

جھگڑا جب دو طرفہ بنیاد پر ختم نہ ہو رہا ہو تو
اس کے بعد جھگڑے کو ختم کرنے کی صورت
صرف یہ ہوتی ہے کہ ــــــــــــــ
ایک فریق یک طرفہ طور پر اسے ختم کردے

ستمبر ۱۹۸۷
شمارہ ۱۳۰

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہور اسلام	25/-
احیاء اسلام	20/-
پیغمبر انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دین فطرت	4/-
تعمیر ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیات اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحاد ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقت حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیات طیبہ	4/-
باغ جنت	4/-
نار جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمت قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۰ ستمبر ۱۹۸۷

فہرست

سبب اپنے اندر	صفحہ	۲	حج کا پیغام	صفحہ	۲۱
ایک مشورہ		۴	سفر آخرت		۲۵
جنگ مطلوب نہیں		۶	ایمان		۲۹
قومی اسلام		۸	خبرنامہ اسلامی مرکز		۴۵
اصل مسئلہ		۱۱	ایجنسی الرسالہ		۴۸

ماہنامہ الرسالہ ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۳۰۰۱۱ ، فون : 697333, 611128

سبب اپنے اندر

قرآن میں اہل ایمان کو یہ یقین دہانی کرائی گئی ہے کہ اگر تم ایمان اور ہدایت پر قائم رہو گے تو دوسروں کی مخالفانہ کارروائیاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔ اس سلسلہ میں دو آیتوں کا مطالعہ کیجیے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

(المائدہ ۱۰۵)

اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ کسی کی گمراہی تم کو نقصان نہیں پہنچائے گی اگر تم ہدایت پر ہو۔

وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ

(آل عمران ۱۲۰)

اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ بے شک اللہ کے بس میں ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

قرآن کے اس اعلان کے مطابق، اہلِ ایمان کے لیے اصل قابلِ توجہ چیز ان کا داخل ہے نہ کہ ان کا خارج۔ اہلِ ایمان کو سب سے زیادہ جس چیز کا اہتمام کرنا ہے وہ یہ کہ وہ خدا کی ہدایت پر قائم رہیں۔ یہ ہدایت ربانی ان کے اندر صبر اور تقویٰ کی صفت پیدا کرے گی۔ اور صبر اور تقویٰ کی صفت ان کے لیے اغیار کی ضرر رسانی کے مقابلہ میں مانع بن جائے گی۔ صبر اور تقویٰ ان تمام تدبیروں اور سازشوں کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر روک ہے جو امکانی طور پر دوسرے لوگ کر سکتے ہیں۔

دنیا میں کوئی شخص یا کوئی قوم تنہا نہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں۔ اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے آزادی عطا کی ہے۔ ہر آدمی اپنے مقصد کے لیے دوڑ رہا ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔ اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے چوٹ لگتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے کوئی نقصان پیش آتا ہے۔ یہ صورت حال خود خدا کی قائم کردہ ہے۔ اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ وہ جس طرح مسلم اور غیر مسلم کی مخلوط آبادی میں ہے اسی طرح وہاں بھی جاری رہے گی جہاں صرف مسلمان ہوں، اور کوئی دوسری قوم وہاں نہ پائی جاتی ہو۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ آدمی ہر ٹکرانے والے سے ٹکرائے۔ اس کا واحد حل وہی

ہے جس کو قرآن میں اعراض (Avoidance) کہا گیا ہے۔ اعراض ہی واحد تدبیر ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص اس دنیا میں اپنا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتا ہے۔

صبر اسی اعراض کی قیمت ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر اور برداشت کا مادہ نہ ہو وہ اعراض نہیں کر سکتے، اور جو لوگ اعراض نہ کریں ان کے لیے اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں۔

تاہم صبر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ صبر کے لیے آدمی کو اپنے مشتعل جذبات کو دبانا پڑتا ہے۔ صبر کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی کھونے کو برداشت کرے۔ صبر کے طریقہ پر وہی آدمی چل سکتا ہے جو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ جائے۔

تقویٰ آدمی کے اندر یہی جوہر پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ سے مراد اللہ کا خوف ہے۔ عام آدمی لوگوں میں جیتا ہے۔ متقی آدمی لوگوں سے گزر کر خدا میں جینے لگتا ہے۔ متقی کی ساری توجہ اس پر لگ جاتی ہے کہ جو کچھ خدا سے ملنے والا ہے اس کو وہ نہ کھوئے۔ وہ بظاہر اسی دنیا میں ہوتا ہے مگر اپنے احساس کے اعتبار سے وہ دنیا سے اٹھ کر آخرت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح تقویٰ آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ اس کے ذہنی استحکام کو منتشر نہیں کرتا۔ کوئی بھی نقصان اس کو اتنا بڑا نظر نہیں آتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے، اور جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ صفت پیدا ہو جائے ان کو تمام قومیں مل کر بھی زیر نہیں کر سکتیں۔

صبر اور تقویٰ کا ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہے۔ صبر کرنا اپنے آپ کو خدا کے حد پر روکے رکھنا ہے۔ اس کے برعکس آدمی جب دشمن کی دشمنانہ کارروائیوں پر بے صبر ہوتا ہے تو اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا سے بے خوف ہو کر حد سے باہر نکل جاتا ہے۔ وہ ایسے کام کرنے لگتا ہے جن سے خدا نے اس کو منع کیا تھا۔ مثلاً دشمن سے متنفر ہو کر اس سے اشتعال انگیزی کا سلوک کرنا، غصہ اور نفرت کی بنا پر فریق ثانی کے بارہ میں انصاف کی بات نہ کرنا، اپنی زیادتی کو گھٹانا اور دوسرا اگر زیادتی کرے تو اس کو بڑھا کر بیان کرنا، دشمنانہ فعل کسی اور نے کیا ہو اور اس کا بدلہ کسی اور سے لینا، حق کی حمایت کرنے کے بجائے قوم کی حمایت کرنا، وغیرہ۔

جو شخص تقویٰ پر ہو وہ خدا کی مدد سے ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور جو شخص تقویٰ کی حد پر قائم نہ رہے وہ خدا کی مدد سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

ایک مشورہ

ڈاکٹر رائٹ (Dr Theodore Paul Wright Jr.) ایک امریکی عالم ہیں۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کو اپنے اختصاصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۷ میں ایل (Yale) یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور ۱۹۶۲ سے ہندستانی مسلمانوں کے معاملات کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا جو کہ تقریباً ایک سو ملین تعداد کے ساتھ انڈونیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہندستان اور پاکستان کے کئی تفصیلی سفر کر چکے ہیں اور پچھلے تقریباً ۲۵ سال سے خاص اسی موضوع پر پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں۔ اس موضوع پر ان کے مقالات ممتاز عالمی جرنلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر رائٹ نے اپنی کتاب ہندستانی مسلمان (*Muslims in India*) میں لکھا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کا معاملہ بڑی حد تک اس پر منحصر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے پاکستانیوں سے کہا ہے کہ آپ لوگوں کو چاہیے کہ غیر موثر انداز میں ان کے مسئلہ کا چمپین بن کر ان کے مسئلہ کو مشکل تر نہ بنائیں :

You shouldn't make things difficult for them
by championing their cause ineffectively.

ڈاکٹر رائٹ نے ہندستان کے مسلمانوں کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ساحلی مسلمان اور اندرونی علاقوں کے مسلمان۔ ساحلی مسلمانوں سے ان کی مراد خاص طور پر جنوبی ہند کے مسلمان ہیں۔ اور اندرونی مسلمانوں سے مراد شمالی ہند کے مسلمان۔ دوسری قسم کے مسلمانوں کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ وہ یادگاری ذہن والے (Monument-conscious) ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو تاج محل اور لال قلعہ اور چار مینار کے درمیان رہتے ہیں۔ ان کا ذہن ابھی تک انھیں شاہی یادگاروں میں اٹکا ہوا ہے۔ یہ یادگاریں انھیں یہ بھولنے نہیں دیتیں کہ وہ کبھی اس ملک میں حکمراں طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

ڈاکٹر رائٹ کا کہنا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے سماج کا لازمی نتیجہ ہے :

What was happening in India was the inevitable result of the working of a caste-ridden, communal-oriented society.

ڈاکٹر رائٹ نے حالات کے گہرے تجزیہ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر نمایاں بنالیں تاکہ وہ ہندو (اکثریتی فرقہ) کے غضب ناکی کا شکار نہ ہوں۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے بہت سخت مشورہ ہے جو فخر کی نفسیات میں مبتلا ہوں اور اپنی عظمت کے نشانات کے درمیان رہتے ہوں۔ مگر اس کے بغیر وہ فسادات کی صورت میں اس کی قیمت ادا کرتے رہیں گے، جو بہت مہنگی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں ماننا چاہیے کہ ہندو ساحلی علاقہ کے تجارت پیشہ مسلمانوں کے خلاف بہت کم یا بالکل توجہ نہیں دیتے :

My advice to Indian Muslims is to be inconspicuous so as not to draw Hindu backlash. This is a very hard advice to follow for a proud people living in the midst of their monuments of glory. But then the price they pay is very heavy in terms of the riots that occur. Hindus, let us admit, pay little or no attention to coastal Muslim trading communities.

ہندستانی مسلمانوں پر مسلمان لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے تقریباً تمام قابلِ ذکر حصہ کو راقم الحروف نے پڑھا ہے۔ مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلہ میں اردو یا عربی یا انگریزی میں جو کچھ لکھا گیا ہے ان سب پر مذکورہ امریکی مستشرق کی تحریر بھاری ہے۔ کسی بھی مسلم اہلِ قلم نے اس مسئلہ کا اتنا گہرا جائزہ نہیں پیش کیا جیسا کہ مذکورہ امریکی عالم نے پیش کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے ماضی کی پُرفخر یادوں میں اٹکے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اب تک اپنے حال کو نہیں سمجھا اور نہ حال کے مطابق وہ اپنے لیے حقیقت پسندانہ منصوبہ بنا سکے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے بہترین مشورہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس "بچھلی سیٹ" پر بیٹھنے کے لیے راضی کر لیں جہاں حالات نے انھیں پہنچایا ہے۔ جدید ہندستان میں باعزت مقام حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا جو راستے ان کے لیڈر پیش کر رہے ہیں وہ صرف بربادی میں اضافہ کرنے والے ہیں نہ کہ کامیابی کی طرف لے جانے والے۔

جنگ مطلوب نہیں

انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کی ایک مستقل سرخی ہے : آج کے لیے ایک خیال (A Thought for Today) ۔ اس سرخی کے تحت اخبار ہر روز کوئی خاص مقولہ نقل کرتا ہے۔ ۱۹ مئی ۱۹۸۷ کی اشاعت میں اخبار نے اس عنوان کے تحت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قول نقل کیا جو انگریزی میں اس طرح ہے :

Paradise lies in the shadow of swords.

(جنّت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے) یہ اقتباس پڑھ کر ایک صاحب نے کہا : اب میری سمجھ میں آیا کہ مسلمان کیوں ہر وقت شمشیر بکف رہتے ہیں۔ جب ان کے پیغمبر نے خود یہ کہا ہو کہ " جنت تلواروں کے سایہ میں ہے " تو اس کے بعد تو وہ یہی کریں گے کہ ہر وقت لڑنے مرنے کے لیے تیار رہیں۔ کیونکہ لڑکر مرنا ان کے عقیدہ کے مطابق ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

مگر یہ غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مذکورہ فقرہ ، اس میں شک نہیں کہ حدیث میں آیا ہے۔ مگر اخبار میں اس کو سیاق سے الگ کرکے نقل کیا گیا ہے ، اس لیے وہ عجیب وغریب مفہوم کا حامل بن گیا ہے۔ اگر اس فقرے کو اس کے پورے مجموعہ کے ساتھ دیکھا جائے تو بالکل دوسرا نقشہ نظر آئے گا۔

یہ فقرہ دراصل ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کے اصل الفاظ نقل کرتے ہیں :

عن ابی النضر : سالم مولی عمر بن عبید اللہ قال : کتب الیہ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ فقرأته حین سار الی الحروریة ، یخبرہ : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی بعض ایامه التی لقیٔ فیها العدوَّ انتظر حتیٰ اذا مالت الشمس ، قام فیهم فقال : یا ایها الناس لاتتمنّوا لقاء العدو ، واسئلوا اللہ العافیة ، فاذا لقیتموهم فاصبروا ، واعلموا انّ الجنة تحت ظلال السیوف ، ثم قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اللّٰهم مُنزلَ الکتاب ومجریَ السحاب وهازمَ الاحزاب ، اهزِمهُم وَانصرْنا علیهم۔ (اخرجہ البخاری ومسلم وابوداؤد)

حضرت سالم کہتے ہیں کہ عمر بن عبید اللہ کو عبداللہ بن ابی اوفیٰ نے لکھا۔ میں نے اس کو پڑھا جب کہ وہ خارجی فرقہ کی طرف گیے تاکہ اس کو بتائیں۔ اس خط میں لکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض دنوں میں جب کہ آپ کا مقابلہ دشمن سے ہوا۔ آپ نے انتظار کیا یہاں تک کہ سورج جھک گیا۔ آپ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اور اللہ سے عافیت مانگو۔ پھر جب ان سے تمہارا مقابلہ پیش آئے تو ثابت قدم رہو۔ اور جان لو کہ جنّت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ، کتاب کو نازل کرنے والے، اور بادل کو چلانے والے، اور فوجوں کو شکست دینے والے، ان کو شکست دے اور ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس حدیث کو امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ تینوں کے یہاں وہ کتابُ الجہاد میں ہے۔ مگر وہ اس کو جس "باب" کے تحت لائے ہیں وہ نہایت بامعنی ہے۔ تینوں نے اس کو اس باب کے تحت نقل کیا ہے کہ "دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو"۔ تینوں کے یہاں ترجمۂ باب کے الفاظ یہ ہیں:

بخاری : باب لا تتمنوا لقاء العدو

مسلم : باب کراھیۃ تمنی لقاء العدو

ابو داؤد : باب کراھیۃ تمنی لقاء العدو

گویا تینوں محدثین کے نزدیک اس حدیث کا اصل مدعا شمشیر زنی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنی حد تک ہمیشہ امن کو پسند کریں، وہ کسی حال میں خود سے جنگ کا آغاز نہ کریں۔

حدیث میں جس عمل کو جنت میں داخلہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے وہ اسلامی دفاع ہے نہ کہ اسلامی جارحیت۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر لوگوں سے لڑا جائے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب اسلام پر کوئی حملہ ہو تو اس کی طرف سے پورا مقابلہ کیا جائے۔ مومن کو خود سے لڑائی نہیں چھیڑنا ہے، مگر جب اسلام کے خلاف جارحیت کی جائے تو اس وقت اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام کے دفاع میں پوری بہادری کے ساتھ حملہ آور سے لڑے۔

قومی اسلام

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیاتی حالت بیان کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کا قول موزوں ترین ہوگا۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا:

میں مسلمان ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں مسلمان ہوں

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ جملہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح ترین تصویر ہے۔ مگر ان کی اسی صحیح تصویر میں ان کے المیہ کی پوری داستان بھی چھپی ہوئی ہے۔

مذکورہ فقرے پر غور کیجیے۔ "مسلمان" کے لفظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآنی انسان ہو۔ اگر اس سے قرآنی انسان مراد لیا جائے تو اس سے وہ انسان مراد ہوگا جو اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ مگر مذکورہ فقرہ کو اس معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قرآنی مفہوم کے اعتبار سے یہ فقرہ بالکل لغو ہے۔ اس کی لغویت کو نہایت آسانی کے ساتھ اس وقت سمجھا جاسکتا ہے جب کہ اس کے الفاظ کو بدل دیا جائے۔ آپ "مسلمان" کی جگہ "اللہ سے ڈرنے والا" رکھ دیجیے اور پھر اس کو اس طرح کہیے:

میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں اللہ سے ڈرنے والا ہوں

دیکھیے، لفظ کو بدلتے ہی یہ فقرہ بالکل بے معنی معلوم ہونے لگا۔ کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو واقعۃً اللہ سے ڈرتا ہو اور وہ اپنی زبان سے یہ الفاظ ادا کرے۔ کیوں کہ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے نہ کہ فخر۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا مذکورہ فقرہ قرآنی مفہوم میں نہیں ہے۔ وہ یقینی طور پر کسی اور مفہوم میں ہے۔

یہ دوسرا مفہوم کیا ہے۔ یہ قومی اور تاریخی مفہوم ہے۔ اس فقرہ میں "مسلمان" کا لفظ اس قوم یا اس نسل کے ایک فرد کے لیے بولا گیا ہے جو ایک خاص تاریخ سے وابستہ ہے۔ جس کے اسلاف نے ملک فتح کیے۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ شاندار تمدن پیدا کیا۔ دنیا میں اپنی سیاسی اور مادی عظمت قائم کی۔ اس دوسرے مفہوم کے اعتبار سے دیکھیے تو مذکورہ فقرہ بالکل درست نظر آئے گا۔ اس دوسرے مفہوم میں لینے کی صورت میں اس فقرہ کی وہ لغویت ختم ہو جائے گی جو پہلے مفہوم میں لینے

کی صورت میں نظر آتی تھی۔

یہ تجزیہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کا مسلمان قرآن کی پیداوار نہیں، وہ تاریخ کی پیداوار ہے۔ اس کا سرمایہ قومی فخر ہے نہ کہ قرآنی حقیقتوں کی دریافت۔ موجودہ مسلمان دوسری قوموں کی طرح ایک قوم ہیں نہ کہ وہ امت جو خدا اور رسول کی بنیاد پر فکری اور روحانی انقلاب کے ذریعہ ظہور میں آئی ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ حالت اتنی عام ہے کہ اس میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ ایک ہی رنگ ہے جس میں تمام مسلمان رنگے ہوئے ہیں، خواہ وہ ان کے چھوٹے ہوں یا ان کے بڑے۔ وہ ان کے پڑھے لکھے لوگ ہوں یا بے پڑھے لکھے لوگ۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے۔ موجودہ مسلمانوں کو فخر والا اسلام ملا، انھیں تواضع والا اسلام نہیں ملا۔ بالفاظ دیگر، انھوں نے تاریخ کو پایا مگر انھوں نے خدا کو نہیں پایا۔ ایسی حالت میں ان کے اندر وہ صفات کیسے پیدا ہوسکتی تھیں جو صرف اس انسان یا اس گروہ میں پیدا ہوتی ہیں جو خدا کو اس طرح پائے کہ وہ اس کے پڑوس میں اپنے صبح و شام گزارنے لگے۔

مسلمانوں کی اسی نفسیات کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر معاملہ میں ان کا رویہ قومی رویہ بن کر رہ گیا ہے۔ اپنے رسول میں انھیں فخر و مباہات کا سامان ملتا ہے مگر اس میں انھیں اطاعت و پیروی کا سامان نہیں ملتا۔ ان کا اسلام انھیں لڑائی جھگڑا سکھاتا ہے مگر وہ انھیں صبر اور اعراض کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ قرآن و سنّت میں انتقام کا سبق پالیتے ہیں مگر وہ اس کے اندر عفو و درگذر کا سبق نہیں پاتے۔ جہاد کا یہ مطلب تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ دوسری قوموں کو اپنا حریف بنا کر ان سے لامتناہی جنگ چھیڑ دی جائے، مگر جہاد کا یہ مطلب سمجھنے سے وہ معذور رہتے ہیں کہ دوسری قوموں کو خدا کے دینِ رحمت کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔

دنیا میں کامیابی کے لیے اعتراف اور مفاہمت اور صبر اور اعراض کی ضرورت ہوتی ہے مگر فخر پسند مسلمانوں کو اس قسم کا رویہ اپنے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔ اس لیے وہ ان کو اختیار بھی نہیں کرپاتے ــــــ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

اقبال اور ابوالکلام اور ان کے جیسے دوسرے شاعروں اور خطیبوں نے مسلمانوں کو جو فکری سرمایہ دیا وہ ایک لفظ میں " فخر " تھا۔ انھوں نے اسلام کو فخر کی چیز بنا کر پیش کیا۔ ایک زوال یافتہ قوم کے لیے یہ ایک دل پسند غذا تھی، چنانچہ مسلمانوں نے دوڑ کر اس کو قبول کر لیا۔ آج تقریباً تمام مسلمان جس اسلام پر کھڑے ہوئے ہیں وہ یہی فخر والا اسلام ہے، اور یہی ان کی تمام بربادیوں کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ایک بڑے شہر کے مسلم لیڈروں کو یہ تدبیر سوجھی کہ مسلمانوں کو اٹھانے کے لیے ان کے اندر فخر والا اسلام زندہ کریں۔ انھوں نے مسلم محلّوں کی دیواروں پر جلی حرفوں میں جگہ جگہ یہ جملہ لکھ دیا :

فخر سے کہو کہ میں مسلمان ہوں

اس کے بعد ہندوؤں کی باری تھی۔ ان کے اندر بھی جوابی جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے شہر کی سڑکوں پر اور بھی زیادہ جلی قلم کے ساتھ ہر طرف یہ الفاظ لکھ ڈالے :

گورو سے کہو کہ میں ہندو ہوں

اس لفظی جنگ کے نتیجہ میں شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ اس کے برعکس اگر مسلمان ایسا کرتے کہ وہ شہر کی دیواروں پر یہ فقرہ لکھتے :

لوگو، خدا سے ڈرو

تو نہ کوئی مقابلہ اور تناؤ ہوتا اور نہ فساد کی صورت پیدا ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کے خود ساختہ اسلام کے نتائج ہیں۔ اگر وہ قرآن وحدیث والے اسلام کو پکڑ لیں تو ہر قسم کے فساد کی جڑ کٹ جائے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تواضع رفعہ اللہ (جو تواضع اختیار کرے اللہ اس کو بلند کرتا ہے)، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا راز تواضع ہے۔ مگر مسلمانوں کا فخر پسندی کا ذہن عین اپنی طبیعت کے اعتبار سے تواضع کا طریقہ اختیار نہیں کر پاتا، اس لیے خدا کی دنیا میں اس کو سرفرازی بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اصل مسئلہ

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ میں لکھتے ہیں : میرٹھ اور دہلی کے فسادات کا حال معلوم ہوا۔ اللہ پاک اپنی پناہ میں رکھے اور رحم وکرم کا معاملہ فرمائے۔ ایک واقعہ میرے دماغ کو جھٹکا دے رہا ہے کہ یہ اللہ کا عذاب تو ہم پر نازل نہیں ہو رہا ہے۔ بنگلہ والی مسجد میں تین دن حاضری کے لیے میں دہلی گیا تھا۔ شاہجہاں پور کٹھور میں میری بہن ہے۔ اس سے ملنے کے لیے گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۸۷ کو ۱۱ بجے میرٹھ بھینسالی بس اسٹینڈ پہنچا۔ بھینسالی بس اسٹینڈ پر انکوائری کے لیے جا رہا تھا کہ شاہجہاں پور کٹھور کے بارہ میں معلوم کروں۔ انکوائری پر دو غیر مسلم عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑی نرمی اور خوش خلقی سے مسافروں کی انکوائری کا جواب دے رہی تھیں۔ مجھ سے آگے ایک مسلم نوجوان اور اس کے ساتھ ایک برقعہ پوش مسلم خاتون انکوائری کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ وہاں حسب ذیل سوال وجواب ہوئے :

مسلم نوجوان — دلی کے واسطے وڈیو کوچ ابھی نہیں آیا کیا۔

انکوائری خاتون — بھیا، وڈیو کوچ ابھی نہیں آیا۔ اس کے بدلے لگزری بس لگی ہوئی ہے، اس سے نکل جاؤ۔

مسلم نوجوان — (زور سے بگڑ کر) ہم وڈیو کوچ پوچھ رہے ہیں، وہ لگزری بس بتا رہی۔

انکوائری خاتون — وڈیو کوچ دو گھنٹے بعد آئے گا۔ تب تک تم دلی پہنچ جاؤ گے۔

برقعہ پوش خاتون — تجھے کیا مطلب، ہم پہنچیں نہ پہنچیں۔ تو بتا وڈیو کوچ کب آئے گا، تو اپنی ڈیوٹی کر۔

انکوائری خاتون — آپ لوگوں کے فائدے کو کہہ رہی ہوں۔ سمے بھی اُدھک لگے گا، پیسہ بھی ڈھائی روپیہ اُدھک۔

برقعہ پوش خاتون — بڑی آئی فائدہ بتانے والی۔ تجھے کیا مطلب، ہم وڈیو سے جاویں یا نہ جاویں۔

مسلم نوجوان — چل آیا بیٹھ۔ دو گھنٹے بعد وڈیو نہ آیا تو اس کی خبریں گے۔ (اس کے بعد وہ ناراض ہوتا ہوا چلا گیا)

اس کے بعد انکوائری کاونٹر کی غیر مسلم خاتون نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا : " مولانا صاحب، ان لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہن بھائیوں پر ویڈیو کا بھوت سوار ہے " مسلمان اسلام کو اپنے عملی رُخ کے ذریعہ ذبح کر رہے ہیں تو مالک کائنات مدعو اقوام کے ذریعہ مسلمانوں کو ذبح کرا رہا ہے۔

عبدالسلام خاں، مائننگ انجینیر، سرکلر روڈ، چھندواڑہ ۴۸۰۰۰۱

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جو بتا رہی ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا مزاج کیا ہے۔ وہ مزاج ہے —— خلافِ مزاج بات کو برداشت نہ کرنا۔ مسلمانوں کا عدم برداشت کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ معمولی اختلافی بات پر بگڑ جاتے ہیں۔ اپنی خواہش کے خلاف کوئی ذرا سی بات ہو تو فوراً لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو وہ مسلمانوں کے اسی بگڑے ہوئے مزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ جھگڑالو قوم ہیں۔ ان کا یہ جھگڑا جب آپس میں ہو تو وہ انفرادی واقعہ بن کر رہ جاتا ہے، وہ عمومی فساد کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ مگر جب اس جھگڑے کا ایک فریق مسلمان اور دوسرا فریق ہندو ہو تو وہ فوراً عمومی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی یہ حالت صرف ہندستان میں نہیں ہے۔ ان کا یہی حال، بلکہ اس سے بھی زیادہ بدتر حال، پاکستان میں ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کہ پاکستان کے مسلمان معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑ نہ جاتے ہوں۔ بات کی وضاحت کے لیے یہاں میں صرف ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔

کراچی کا واقعہ ہے۔ ۱۹ جولائی ۱۹۸۷ کی رات کو کچھ مسلم نوجوان ایک منی بس میں سفر کر رہے تھے۔ سفر کے دوران ان کے اور کنڈکٹر کے درمیان تکرار ہو گئی۔ نوجوانوں نے کنڈکٹر پر حملہ کر دیا۔ بس رک گئی۔ اس کے بعد پولس آئی۔ پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کر دیا۔ مگر نوجوانوں کا غصہ ختم نہیں ہوا۔ اس وقت وہ چلے گیے اس کے بعد انھوں نے پولس کی " زیادتی " کی داستان سنا کر اپنی قوم کے مزید نوجوانوں کو بھڑکایا۔ اور ایک بھیڑ جمع کر کے ۲۱ جولائی کو کراچی کے اس تھانہ پر حملہ کر دیا۔ جہاں کی پولس نے دخل دے کر معاملہ کو ختم کیا تھا۔

اس " حملہ " میں ایک پولس افسر شدید طور پر زخمی ہوا۔ اور دو پولس کانسٹبل مارے گیے

اب پولیس مشتعل ہوگئی۔ اس نے لوگوں کے اوپر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ اس کے نتیجہ میں بیس آدمی سخت زخمی ہوگیے۔ ان زخمی ہونے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔ کئی موتیں بھی واقع ہوئیں (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ جولائی ۱۹۸۷)

یہ بات میں نے ایک مسلمان لیڈر سے کہی تو وہ بگڑ گیے۔ انھوں نے تیز و تند لہجے میں کہا: یہ جھوٹ ہے۔ مسلمان کبھی فساد نہیں کرتا۔ آپ مسلم دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اس لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں آپ کو اپنی یہ بکواس بند کرنی پڑے گی، ورنہ مسلمان آپ کو سبق پڑھانے پر مجبور ہوں گے۔

میں نے نرمی کے ساتھ جواب دیا: میرے بھائی، آپ نے خود ہی میرے دعوے کا ثبوت فراہم کردیا۔ آپ نے اس وقت جو انداز اختیار فرمایا ہے، اسی کا نام اشتعال انگیز ردعمل ہے اور یہ اشتعال انگیز ردعمل ہی تمام فرقہ وارانہ فسادات کی اصل جڑ ہے۔ آپ اور آپ جیسے دوسرے مسلمان باہمی معاملات میں سنجیدہ انداز اختیار کرنا نہیں جانتے، اسی سے معمولی واقعہ فساد بن جاتا ہے۔ اگر آپ لوگ سنجیدہ اور مثبت انداز اختیار کرنا سیکھ لیں تو تمام فسادات کی جڑ کٹ جائے۔

یک طرفہ اقدام کی ضرورت

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلے میں یہ بات تقریباً ثابت شدہ ہے کہ اس کا آغاز ہمیشہ کسی مسلمان کی اشتعال انگیز کارروائی سے ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ابتداءً ایک ہندو اور ایک مسلمان کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد خود مسلمانوں ہی کے پیدا کردہ حالات کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ انفرادی واقعہ بہت جلد قومی واقعہ بن جاتا ہے۔ دو فرد کا فساد دو قوم کے فساد کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اب ہندو چونکہ اس ملک میں طاقت ور پوزیشن میں ہے، اس کا ردعمل مسلمان کے حق میں بہت ہولناک ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو ایک کے بدلے میں ایک سو کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

فساد کے نتائج کو اگر صرف کمیت اور اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہندو ظالم نظر آئیں گے اور مسلمان مظلوم۔ مگر میں اس تقسیم کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ قرآن کی رو سے اصل مجرم وہ ہے جو آغاز کرے (وھم بدؤکم اول مرۃ) تاہم ایک شخص کو یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ یعنی اس کا امکان ہے کہ میری رائے درست ہو اور یہ بھی امکان ہے کہ ان

لوگوں کی رائے درست ہو جو ہندو کو ظالم قرار دیتے ہیں۔ مگر معاملہ کا ایک پہلو اور ہے۔ اور اس معاملہ میں یقینی طور پر سنجیدہ انسانوں کی دو رائے نہیں ہو سکتی۔

یہ دوسرا پہلو معاملہ کا عملی پہلو ہے۔ یعنی یہ کہ یہ فسادات ختم کس طرح ہوں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس طرح کے پے چیدہ نزاعات ہمیشہ یک طرفہ اقدام سے ختم ہوتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ۵۰ فی صد ذمہ داری ہندو لیں اور ۵۰ فی صد ذمہ داری مسلمان قبول کریں اور اس طرح دونوں کے مشترکہ فیصلہ سے فسادات کا خاتمہ کیا جائے تو ایسا مشترکہ فیصلہ کبھی ہونے والا نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں مشرکین مکہ اور مسلمانانِ مدینہ کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کی شکل میں یک طرفہ طور پر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہو گیے دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ اور جاپان کا جھگڑا صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ جاپان نے یک طرفہ طور پر امریکہ کی تمام شرائط کو مان لیا۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات بھی اسی طرح یک طرفہ تدبیر کے ذریعے ختم ہوں گے یا پھر وہ اسی طرح لامتناہی طور پر جاری رہیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس یک طرفہ اقدام کے لیے کون آگے بڑھے۔ جواب بالکل واضح ہے۔ یک طرفہ اقدام پر ہمیشہ وہ فریق راضی ہوتا ہے جو تصادم کی صورت میں زیادہ نقصان اٹھا رہا ہو۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں زیادہ بڑا نقصان مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں ہی کو اس معاملہ میں پہل کرنا چاہیے۔

اس نقصان سے میری مراد مادی نقصان نہیں ہے، بلکہ آخرت کا نقصان ہے۔ اس معاملہ میں یقینی طور پر ہندو بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ نقصان براہ راست کم اور بالواسطہ زیادہ ہے۔ تاہم ہندو کا جو نقصان ہے وہ مادی اور اقتصادی اعتبار سے ہے۔ جب کہ مسلمان کا نقصان یہ ہے کہ وہ دعوت کے امکان کو کھو دیتا ہے۔ ہر بار جب فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہندو مسلم تناؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس مسلسل تناؤ نے اس فضا کو برباد کر کے رکھ دیا ہے کہ ہندو کے سامنے مسلمان اپنی وہ دعوتی ذمہ داری ادا کریں جو آخری پیغمبر کا امتی ہونے کی حیثیت سے لازمی طور پر ان کے اوپر عاید ہوتی ہے۔ اور جس ذمہ داری کو ادا کیے بغیر خود مسلمانوں کی اپنی نجات بھی سخت مشتبہ ہے۔

دکان دار اور گاہک میں جھگڑا ہو اور دونوں کے درمیان دوری پیدا ہو جائے تو زیادہ بڑا لوزر (کھونے والا) کون ہوگا۔ واضح ہے کہ ایسی صورت میں زیادہ بڑا لوزر دکان دار ہوگا۔ اس لیے دکاندار ہی کو یہ ذمہ داری لینی پڑتی ہے کہ وہ اپنے اور گاہک کے درمیان دوری کے اسباب پیدا نہ ہونے دے۔ اگر بالفرض دوری کا کوئی سبب پیدا ہو جائے تو وہ یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرے۔

یہ ایک دنیوی مثال ہے۔ یہی مثال آخرت کے معاملہ کی بھی ہے۔ مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان جھگڑا اور تناؤ پیدا ہو تو زیادہ بڑا لوزر یقینی طور پر مسلمان ہوگا۔ کیوں کہ اس دوری کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے مدعو کو کھو رہا ہے۔ جب کہ مسلمان کے عقیدے کے مطابق، مدعو اس کے لیے تمام قیمتی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ دعوت کا عمل اس کو انصار اللہ کا درجہ عطا کرتا ہے۔ دعوت کا عمل اس کو پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل کرتا ہے۔ اس لیے مسلمان ہی کو یہ ذمہ داری لینی ہے کہ وہ اپنے اور مدعو کے درمیان تناؤ پیدا نہ ہونے دے اور اگر کسی وقت تناؤ کی صورت پیدا ہو جائے تو یک طرفہ طور پر اس کو ختم کر دے۔

اصل مسئلہ

اس دنیا کا ایک خالق اور مالک ہے۔ اس نے تمام انسانوں کو ایک خاص منصوبہ کے تحت پیدا کیا ہے۔ وہ منصوبہ یہ ہے کہ انسان کو موجودہ دنیا کے حالات میں رکھ کر آزمائے۔ اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جنت یا جہنّم میں داخل کرے (الملک ۲)

یہی وہ حقیقت ہے جس سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے تمام پیغمبر آئے (رسلاً مبشرین ومنذرین لئلاّ یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل) مگر پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کو ان کی امتیں ضائع کرتی رہیں۔ آخر میں اسی انذار و تبشیر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ آپ جو تعلیم لائے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔

قرآن میں یہی ابدی دین اپنی محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اب انسان کی نجات کا انحصار اسی محفوظ دین کو اختیار کرنے پر ہے جس کا نام اسلام ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (آل عمران ۸۵)

ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ مسلمانوں کی یہ منصبی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو اس حقیقت سے باخبر کریں تاکہ بھٹکی ہوئی قوموں پر نجاتِ آخرت کا دروازہ کھلے۔ اور جو لوگ معلوم ہو جانے کے باوجود خدا کی ہدایت کو اختیار نہ کریں ان پر یہ گواہی قائم ہو جائے کہ انھیں حقیقتِ واقعہ سے باخبر کر دیا گیا تھا (لیکون الرسول شہیداً علیکم وتکونوا شہداء علی الناس، الحج ۷۸) یہ ذمہ داری اتنی اہم ہے کہ اس کو ادا نہ کرنے کی صورت میں خود یہ معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے یہاں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی قرار پائیں گے یا نہیں۔

اس حقیقت کی روشنی میں غور کیجیے تو مسلمانوں کے ساتھ اس ملک میں جو کچھ پیش آرہا ہے وہ اسی خدائی ڈیوٹی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے دوسری قوموں کو خدائی پیغام سے آگاہ کرنے کا کام انجام نہیں دیا۔ اس لیے اب خدائی قانون کے مطابق ان کی تنبیہ کی جارہی ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کے بارے میں آگاہ ہو جائیں۔

جب بھی اس ملک میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے اور مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں تو ہمیشہ اس سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ "قال" کی زبان میں نہیں بلکہ "حال" کی زبان میں۔ وہ آواز یہ ہوتی ہے:

تم نے ہماری آخرت کو برباد کیا، ہم تمہاری دنیا کو برباد کریں گے

مسلمانوں کے پاس خدا کے محفوظ دین کی امانت ہے۔ مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ اس ملک کے تمام انسانوں کو اس نازک حقیقت سے باخبر کریں۔ وہ اس کو لوگوں کی قابلِ فہم زبان میں لوگوں تک پہنچائیں۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ صدیاں گزر گئیں مگر مسلمانوں کے درمیان اس مقصد کے لیے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس حقیقت ربانی سے لوگوں کو آشنا کریں۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے یہ کیا کہ انھوں نے لوگوں سے نفرت کی۔ انھوں نے لوگوں کو حقیر سمجھا۔ وہ لوگوں کی ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر ان سے لڑائی چھیڑتے رہے۔ انھوں نے اپنے اور ان کے درمیان مصنوعی تشخصات کی دیواریں کھڑی کیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگ مسلمانوں سے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے دین سے بیزار ہو گئے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وہ معتدل

فضا باقی نہ رہی جس میں دوسرے لوگ مسلمانوں کے دین پر غور کریں اور اس کے بارے میں ٹھنڈے ذہن کے ساتھ فیصلہ کرسکیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ تھا۔ داعی ایک کامیاب دکاندار کی طرح، یک طرفہ اخلاقیات پر کھڑا ہوتا ہے۔ داعی اپنے آپ کو اس کا پابند بناتا ہے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرے گا۔ مدعو اگر کوئی برا سلوک کرے تب بھی وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، تاکہ دونوں کے درمیان کہنے اور سننے کا ماحول برباد نہ ہونے پائے۔ مگر مسلمان اس داعیانہ اخلاق پر قائم نہ رہ سکے۔

مسلمانوں نے لوگوں سے ان کی آخرت چھینی تھی، اب لوگ ان سے ان کی دنیا چھین رہے ہیں۔ لوگ اپنے ظلم سے صرف اس وقت باز آئیں گے جب کہ ہم اپنے ظلم سے باز آئیں۔ اس سے پہلے یہ سلسلہ بند ہونے والا نہیں۔

خدا کی تنبیہ

مسلمانوں کے ساتھ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو کا ظلم نہیں بلکہ وہ خدا کی تنبیہ ہے۔ جو آدمی اس میں شک کرے اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے، یا کم از کم یہ کہ وہ قرآن و حدیث سے بالکل ناواقف ہے۔

مسلمانوں کے مسئلہ کی جڑ یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے بندوں کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو خدا کے حکم کے سراسر خلاف تھا۔ مسلمان اپنے دورِ اقتدار میں ہندوؤں کو حقیر سمجھتے رہے۔ اور اب جب کہ ان کے پاس اقتدار نہیں ہے تو وہ ہندوؤں کو اپنا دشمن سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر جرم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہندو قوم مسلمانوں کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمان داعی ہیں اور ہندو مدعو ہیں۔ ہندو کی نسبت سے مسلمان کے اوپر سب سے پہلا اور سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اس کو خدا کے دین کا پیغام پہنچائیں۔ اپنے اور ہندو قوم کے درمیان ناصحانہ فضا قائم کرنے کے لیے مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ہندو کی طرف سے پیش آنے والی شکایتوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کریں۔ جس طرح مسلمانوں پر دعوت فرض ہے، اسی طرح دعوت کی خاطر صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کرنا بھی

ان کے اوپر فرض ہے۔

مسلمان اس ملک میں سیکڑوں سال سے ہندوؤں کے ساتھ رہ رہے ہیں مگر ان کے درمیان کوئی ایک بھی قابلِ ذکر تحریک یا قابلِ ذکر شخصیت نہیں ابھری جو مسلمانوں کو ان کے داعیانہ فرض کی طرف توجہ دلائے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا سب سے بڑا خلا ہے جس پر انھیں سب سے زیادہ غور کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا یہ حال ہے کہ اس کو اس کام کی اہمیت کا شعور ہی نہیں۔ بعض افراد اگر اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں تو وہ بھی یہ کہہ کر عملاً اسے قابلِ ترک قرار دیدیتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرلو، اس کے بعد غیر مسلموں کی اصلاح کرنا۔ یہ دونوں ہی باتیں یکساں طور پر خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں۔ پہلی روش اگر خدا اور رسول کے حکم سے سرتابی ہے تو دوسری روش کا مطلب خود اپنے آپ کو خدا اور رسول کی جگہ بٹھانا ہے۔ کیوں کہ سارے قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کرو، اور جب مسلمانوں کی اصلاح کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد غیر مسلموں کو خدا کے دین کی دعوت دو۔ اور جب قرآن وحدیث میں ایسا کوئی حکم بیان نہیں ہوا تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ احکام دین کی فہرست میں خود ساختہ طور پر اس قسم کے ایک حکم کا اضافہ کرے۔

مسلمانوں کا موجودہ مسئلہ اسی فرض سے ان کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ مسائل کا یہ سلسلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک غفلت کی یہ صورتِ حال باقی رہے۔ ان مسائل کا حل یہ نہیں ہے کہ مسلمان دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دے کر ان سے لڑنا شروع کر دیں۔ ان کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اپنی کوتاہی کا اقرار کرکے اس فریضۂ دعوت کو ادا کرنا شروع کر دیں جس کو انھوں نے صدیوں سے چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے سوا ہر دوسری تدبیر ان کی سرکشی میں اضافہ کے ہم معنی ہے نہ کہ مسئلہ کے حل کی طرف پیش قدمی۔

مسلمان اگر بالفرض یہ محسوس کریں کہ وہ برادرانِ قوم کو دعوت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تب بھی وہ یقینی طور پر ایک کام کرنے کی پوزیشن میں ہیں، اور وہ دعا ہے۔ "دعوت نہ دے سکو تو دعا کرو" یہ ایک لفظ میں مسلمانوں کے پروگرام کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں کو پورے اخلاص

کے ساتھ برادرانِ وطن کی ہدایت کا حریص بننا چاہیے۔ دعوت کے مواقع نہ ہوں تو ان کے حق میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ دعا کرنا چاہیے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ براہ راست دعوت کے مواقع ہمارے لیے کھول دے۔

مگر مسلمانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ برادران وطن کو خدا کے دینِ رحمت کا مخاطب بنانا تو درکنار، مسلمان پچاس برس سے ان کے خلاف بد دعائیں کرنے میں مشغول ہیں۔ ان کے تمام اصاغر و اکابر اللّٰھم اھلك الکفرۃ والمشرکین کی پکار بلند کیے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ ان کی اس قسم کی بددعا کبھی خدا کے یہاں قبول ہونے والی نہیں، خواہ مسلمان ایک ہزار سال تک اس کے الفاظ دہراتے رہیں، اور خواہ ان کے تمام اکابر و اعاظم جمع ہو کر اس پر آمین کہہ رہے ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تمام بد دعائیں خدا کی منشا کے بالکل خلاف ہیں۔ دوسری قوموں کے لیے ہمارے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کو خدا کے دین رحمت کے سایہ میں لائیں نہ کہ دینِ رحمت میں لانے کی واقعی کوشش کیے بغیر انھیں عذاب کے گڑھے میں دھکیلنے لگیں۔ آج خدا اس انتظار میں ہے کہ ہم اس کے سامنے لوگوں کی ہدایت کی دعا پیش کریں تاکہ وہ اس کو قبول کر کے اقوام عالم کے لیے ہدایت کا راستہ کھولے۔ اور ہمارا حال یہ ہے ہم خدا کے سامنے لوگوں کی ہلاکت کی دعا پیش کر رہے ہیں۔ ایسی دعا خود دعا کرنے والے کے منھ پر مار دی جائے گی، وہ کبھی قبولیت کا شرف حاصل کرنے والی نہیں۔

روشنی دینا دنیا کو سب سے بڑی چیز دینا ہے۔ مگر روشنی دینا سب سے بڑی قربانی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ دنیا کو "روشن" کرنے کے لیے اپنے آپ کو "بے روشن" کر لینا پڑتا ہے۔ اسی بات کو یک مغربی مفکر نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ موم بتی دوسروں کے لیے اُجالا کرتی ہے مگر وہ خود اپنے پ کو فنا کر لیتی ہے:

A candle lights others and consumes itself.

داعی کی مثال بھی یہی ہے۔ چنانچہ پیغمبرؐ کو قرآن میں سراج منیر کہا گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے ہ داعی کا مقام بہت بلند ہے۔ داعی کے لیے دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمتیں مقدر

ہیں۔ مگر اس خصوصی انعام کا حق دار بننے کے لئے آدمی کو خصوصی قربانی بھی دینا ہے۔ اور وہ خصوصی قربانی یہ ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر تمام ناخوش گواریوں کو برداشت کرے۔ وہ ہر حال میں مدعو کا خیر خواہ بنے، خواہ مدعو اس کے ساتھ ظلم اور عداوت کا معاملہ کیوں نہ کر رہا ہو۔

مدعو کے خلاف نفرت اور انتقام اور مقابلہ آرائی کا طریقہ اختیار کرنا منصوبۂ خداوندی کے سراسر خلاف ہے۔ اور جو لوگ خدا کے منصوبہ کے خلاف عمل کریں وہ خدا کی دنیا میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں۔

موجودہ مسائل کو حل کرنا ہے تو اس کے سبب کو دور کیجئے۔ اور وہ سبب یہ ہے کہ اپنی داعیانہ کوتاہی کو ختم کیجئے۔ اپنے اور برادرانِ وطن کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کیجئے۔ اس فریضہ کو ادا کرنے کے بعد ہی مسلمان عزت کا مقام پا سکتے ہیں۔ بندوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں بھی۔ اس کے سوا نجات اور کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حج کا پیغام

۱۹۸۲ سے پہلے میں نے حج کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ ۱۹۸۲ میں مجھے خود بھی حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس مطالعہ اور تجربہ کے بعد حج کا پیغام جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ــــــ انسان اپنے رب کی طرف دوڑے، انسان اپنے خالق کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنائے۔ حج کا عمل اگرچہ صرف چند دن کے لیے کیا جاتا ہے مگر وہ پوری زندگی کا ایک سبق ہے۔ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک علامتی رہنما ہے۔

ایک آدمی جب اپنے وطن اور اپنے گھر بار کو چھوڑ کر حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ سفر کر کے اللہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی دنیا سے نکال کر خدا کی دنیا میں پہنچا رہا ہے۔ وہ وہاں جا رہا ہے جہاں اللہ کا گھر (بیت اللہ) ہے۔ جہاں اللہ کے رسول اور اس کے اصحاب کے کارنامے ثبت ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی زندگیوں کے نشانات ہیں جو اللہ کے لیے جیے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دیدی۔ اسی کے ساتھ حاجی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس مقام کی زیارت کے لیے جا رہا ہے جس کو خدا نے اپنی آخری ہدایت کے اظہار کے لیے خصوصی طور پر چنا تھا۔

اس طرح حج کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے (یا یہ ہونا چاہیے) کہ حاجی کا ذہن خدا رخی ذہن بن جاتا ہے۔ اس کو خدا کی یاد آنے لگتی ہے۔ اس کا دماغ خدا کی باتوں سے بھر جاتا ہے۔ اب تک اس کی سوچ اگر اپنی ذات کی طرف چل رہی تھی تو اب اس کی سوچ خدا کی طرف چل پڑتی ہے۔

آدمی جس چیز کے بارے سوچے اسی کے لحاظ سے اس کی نفسیات بنتی ہے۔ آپ اپنے ذاتی مقصد کے لیے اٹھیں تو آپ کا ذہن خود اپنی ذات کے گرد گھومے گا۔ مگر جب ایک شخص خدا کی طرف روانہ ہو رہا ہو تو اس کا ذہن خدا کی طرف لگ جاتا ہے۔ اس کو خدا والی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ خدا نے مجھے پیدا کیا۔ اسی نے مجھے ہر قسم کے مواقع دیئے۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں دنیا میں کام کروں۔ اسی کی توفیق سے یہ ممکن ہوا کہ میں وہ وسائل جمع کروں جن کی مدد سے آج میں بیت اللہ کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر آخر کار مجھ پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ مجھ پر موت آئے۔

اور میں خدا کے دربار میں براہِ راست حاضر کر دیا جاؤں۔

یہ چیزیں حاجی کے سفر کو مکمل معنوں میں ایک روحانی سفر بنا دیتی ہیں۔ بظاہر وہ ایک مادی سفر میں ہوتا ہے مگر اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وہ ایک معنوی سفر کے اعلیٰ منازل طے کر رہا ہوتا ہے۔

جب حرم میں داخل ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو تمام حاجی اپنے اپنے کپڑے اتار کر ایک نئے قسم کا "یونیفارم" پہن لیتے ہیں۔ ہر شخص ایک ہی قسم کا بغیر سِلا ہوا لباس اپنے جسم کے اوپر ڈال لیتا ہے۔ یہ اس بات کی ایک عملی یاددہانی ہے کہ حاجی اب نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ اپنے قومی لباس کو اتار کر وہ اپنے آپ کو گویا اس طرزِ زندگی سے الگ کر لیتا ہے جو اس کے ماحول نے اسے سکھایا تھا۔ وہ اس احساس کو اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے کہ آدمی اپنے اوپر طاری کرے۔ لاکھوں انسان اپنے اپنے رنگ کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

جسم پر احرام کا ربّانی لباس ڈالنے کے بعد حاجی کی زبان بھی ربّانی کلام بولنا شروع کر دیتی ہے۔ اب حاجی لبیک لبیک کی صدا بلند کرنے لگتا ہے۔ گویا کہ خدا اس کو پکار رہا تھا اور وہ اس کی پکار پر دوڑ کر آ گیا اور کہنے لگا کہ خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں۔ لبیک لبیک کہنے کا یہ عمل حاجی کی طرف سے برابر جاری رہتا ہے۔

"حاضر ہوں" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکّہ میں رہنے کے لیے حاضر ہوں۔ یہ وطن کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ نہیں بلکہ روش کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیری فرمانبرداری کے لیے حاضر ہوں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ تو جو حکم دے اس پر میں دل و جان سے قائم ہو جاؤں۔ "لبیک" کا اقرار آدمی حج کے مقام پر کرتا ہے مگر اس کی عملی تصدیق وہاں سے لوٹ کر اس کو اپنے وطن میں کرنی پڑتی ہے جہاں کے روز و شب میں وہ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔

مکّہ پہنچ کر آدمی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ ایک وسیع مسجد ہے۔ اس کے کشادہ صحن کے بیچ میں کعبہ کی وہ تاریخی عمارت کھڑی ہوئی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ حاجی بیت اللہ کے صحن میں اس کعبہ کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ وہ سات

بار اس کا چکر لگاتا ہے۔ اس طرح گویا وہ تمثیلی طور پر اس بات کا عملی مظاہرہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ خدا کو اپنی زندگی میں مرکزی مقام دے کر اس کے گرد اپنی پوری زندگی گزارے گا۔

طواف کے بعد حاجی صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ وہ صفا سے مروہ کی طرف جاتا ہے اور پھر مروہ سے صفا کی طرف جاتا ہے۔ اس طرح وہ تیز قدمی کے ساتھ سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ بھی گویا تمثیل کے روپ میں ایک عہد ہے۔ یہ اپنی سرگرمیوں کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے عزم کا اظہار ہے۔ اس عمل کے دوران بظاہر حاجی دو پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان سعی کرتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ سعی خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کا اظہار ہے، جو ایک تاریخی واقعہ کے اعادہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔

حج کے دوران کی سب سے اہم عبادت وہ ہے جس کو وقوف عرفہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عرفات کے میدان میں پہنچ کر وہاں قیام کرنا۔ یہ ایک بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ "خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں" کہتے ہوے اور ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے عرفات کے وسیع اور کھلے ہوئے میدان میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ گویا حشر کے میدان میں خدا کے سامنے حاضری کا ایک دنیوی نقشہ ہوتا ہے۔ عرفات میں اس طرح جمع ہونا حاجی کو میدان حشر میں جمع ہونے کا منظر یاد دلاتا ہے وہ اس کو اس سب سے بڑی حقیقت کا احساس دلاتا ہے جس کا احساس اگر واقعی معنوں میں انسان کو ہو جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس کے تمام معاملات اپنے آپ سنورتے چلے جائیں۔

حج کے دوران کا ایک عمل یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ یہ ایک علامتی عمل ہے۔ جمرہ پر کنکری مار کر حاجی اپنے اس عزم کو تازہ کرتا ہے کہ اسی طرح وہ شیطان کو مارے گا اور اس کو اپنے سے دور بھگائے گا۔ شیطان سے اس کا رشتہ دوستی کا رشتہ نہیں بلکہ دشمنی اور مقابلہ کا رشتہ ہے۔ اس علامتی عمل کو آدمی اگر حقیقی عمل بنالے، وہ واقعۃً شیطان کو اپنے سے دور بھگائے تو اس کے اندر سے تمام خرابیاں نکل جائیں۔ کیوں کہ ہر قسم کی خرابیاں شیطان ہی کے سکھانے سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حاجی اللہ کی راہ میں جانور قربان کرتا ہے۔ یہ قربانی بھی ایک تمثیلی عمل ہے۔ چنانچہ اس کو قرآن میں شعائر اللہ (علاماتِ خداوندی) میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جانور کی قربانی خود اپنی قربانی

کی تمثیل ہے۔ جانور کو قربان کرکے حاجی عمل کی زبان میں اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں سب کچھ دینے کے لیے تیار رہے۔ حتی کہ اگر وہ وقت آجائے کہ اس کو اپنی جان خدا کی راہ میں دے دینا ہو تو وہ اپنی جان بھی خدا کی راہ میں دیدے گا۔ وہ اپنی آخری قیمتی پونجی بھی اللہ کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

یہ تقریر ۱۸ جولائی ، ۱۹۸۷ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

سفرِ آخرت

جولائی ۱۹۸۷ کی ۲۱ تاریخ تھی اور دن کے ساڑھے دس بجے کا وقت۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی "میں حیدر آباد سے حبیب بھائی بول رہا ہوں"۔ السلام علیکم اور وعلیکم السلام کے تبادلہ کے بعد دوسری آواز غم ناک لہجہ میں یہ سنائی دی "میرے والد کا انتقال ہو گیا"۔

آواز جانی پہچانی تھی۔ واضح طور پر یہ حبیب بھائی تھے جو ٹیلی فون پر بول رہے تھے۔ "میرے والد" کے لفظ سے بھی بلا اشتباہ بابو بھائی (غلام محمد صاحب) مراد تھے۔ مگر اس اچانک خبر کو سننے کے لیے میرا ذہن تیار نہ تھا۔ میں نے دوبارہ کہا "کیا فرمایا، کیا بابو بھائی" انھوں نے کہا کہ ہاں بابو بھائی۔ میں نے کئی بار اپنے سوال کو دہرایا اور ہر بار یہی جواب ملا کہ ہاں، بابو بھائی کا انتقال ہو گیا۔ آخر مجھے ماننا پڑا کہ وہ بزرگ اب اس دنیا میں نہیں رہے جو اسلامی مرکز کے مشن میں اول روز سے میرے قریبی رفیق بنے ہوئے تھے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۶۳ سال تھی۔ سالِ پیدائش ۱۹۲۴ ہے۔

بابو بھائی کو پہلی بار میں نے بھوپال میں ہونے والے اسلامی مرکز کے اجتماع میں دیکھا تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ کو جب میں اجتماع گاہ میں پہنچا تو ایک صاحب ملاقات کے لیے میری طرف بڑھے۔ بھرا ہوا جسم، سادہ لباس، چہرہ پر ہلکی مسکراہٹ، بولنے سے زیادہ سننا، کہنے سے زیادہ کرنا، پورا وجود سنجیدگی کی تصویر بنا ہوا۔ یہ تھا ان کا حلیہ۔ غائبانہ طور پر میں ان کو پہلے ہی جان چکا تھا۔ اب ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ میری ذہنی تصویر سے کہیں زیادہ عظیم ہیں۔

اس کے بعد بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے کئی بار دہلی کا سفر کیا۔ میں خود جب بھی حیدر آباد جاتا تو انھیں کے یہاں ٹھہرتا۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر بہت زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ بہت زیادہ حساس تھے مگر ان کی حساسیت پوری طرح ان کے شعوری فیصلہ کے تابع تھی۔ ۲۱ جولائی کی شام کو میں حیدر آباد پہونچا تو ان کے صاحبزادے حبیب بھائی صاحب مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ حبیب بھائی کی زبان سے بار بار اس قسم کے

الفاظ نکل رہے تھے : آپ کا ایک اچھا پروانہ چلا گیا، آپ کا ایک اچھا عاشق چلا گیا ۔۔۔۔

مولانا اکبرالدین قاسمی نے بتایا کہ بابو بھائی نے مرکز کے لیے کبھی کسی چیز کا انکار نہیں کیا۔ اسلامی مرکز کے ہر خرچ کو اپنی جیب سے دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بلکہ انھیں یہ شکایت رہتی تھی کہ آپ لوگ " خرچ " کا کوئی منصوبہ بنا کر نہیں لاتے ۔ دو کتابیں (سچا راستہ اور دینی تعلیم) تلگو زبان میں ترجمہ کر کے شائع کی گئیں تو اس کا پورا خرچ بابو بھائی نے ادا کیا۔

بابو بھائی حیدرآباد میں اسلامی مرکز کے مشن کو پھیلانے کے لیے مستقل طور پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے رہتے تھے۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ ایک بار بھی انھوں نے مجھ سے کہا ہو کہ میں نے فلاں مد میں اتنی رقم دی ہے۔ مجھے جب بھی ان کے انفاق کے متعلق معلوم ہوا تو حیدرآباد کے دوسرے احباب کے ذریعہ معلوم ہوا۔ حیدرآباد کے ساتھیوں نے بتایا کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کام کا نقشہ آپ لوگ بنائیے ، پیسہ مجھ سے لیجیے۔ وہ مختلف لوگوں کے نام اپنی طرف سے الرسالہ جاری کرتے رہتے تھے یا کتاب بھیجتے رہتے تھے مگر کبھی اپنی زبان سے انھوں نے یہ نہیں کہا کہ فلاں کی طرف سے رقم میں نے ادا کی ہے۔

علم النفس کی اصطلاح کے مطابق وہ پورے معنی میں ایک (Balanced personality) متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ حیدرآباد کے ایک تاجر شری اُتم بھائی نے کہا کہ میرے ساتھ ان کا ۲۰ سال سے کاروباری تعلق تھا۔ مگر کبھی اختلاف یا شکایت کی نوبت نہیں آئی۔ ان کے کارخانہ کے ایک کارکن صالح عمودی نے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے وہ باپ کے برابر تھے۔ ایسا آدمی مشکل سے ملے گا، بلکہ ملے گا ہی نہیں ۔

حبیب بھائی نے بتایا کہ وہ ہمیشہ معاملات کی اصل جڑ کو دیکھتے تھے۔ ایک بار کارخانہ میں آگ لگی تو سب سے پہلے انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ آگ کیسے لگی۔ جب معلوم ہوا کہ یہ آگ بجلی سے لگی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ تار پرانے ہو گئے ہیں تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ سارے تار بدلوا دیئے۔ وہ بڑے نقصان کے مقابلہ میں چھوٹے نقصان کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ کیوں کہ "بڑا نقصان ایک بار پیش آتا ہے اور چھوٹا نقصان بار بار ہوتا ہے۔"

ایک مرتبہ ان کے کارخانہ کے ورکروں نے اسٹرائک کر دی۔ کیس عدالت تک پہونچا۔

بابو بھائی کو کامیابی ہوئی اور کئی ورکر، یونین کے صدر اور سکریٹری سمیت نکال دیئے گیے۔ کچھ دن کے بعد بابو بھائی کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ بے روزگار پھر رہے ہیں تو ان کو بلایا اور انھیں دوبارہ اپنے کارخانہ میں رکھ لیا۔ اس کے بعد وہ لوگ اتنا متاثر ہوئے کہ آئندہ وہ کارخانہ کے بہترین ورکر بن گیے۔

بابو بھائی اپنے ظاہر کے اعتبار سے ایک تاجر تھے مگر وہ اپنے اندرونی احساس کے اعتبار سے متوکل علی اللہ تھے۔ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ یہ تلقین کیا کرتے تھے کہ زیادہ کی حرص میں نہ پڑو، بلکہ قناعت کا طریقہ اختیار کرو۔ ایک بار جب ان کے کارخانہ میں آگ لگ گئی تو انھوں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ فائر بریگیڈ کو ٹیلی فون کر دو اور خود تم لوگ جو کر سکتے ہو کرو۔ یہ کہہ کر مسجد میں نماز کے لیے چلے گیے اور پرسکون طور پر نماز ادا کر کے واپس آئے۔

ایک صاحب نے بتایا کہ وہ حج کے سفر پر جا رہے تھے۔ آخر میں انھیں محسوس ہوا کہ ان کے پاس پیسے کچھ کم ہیں۔ وہ بابو بھائی کے پاس آئے اور ان سے دو ہزار روپئے قرض کے لیے کہا۔ بابو بھائی زبان سے کچھ نہیں بولے۔ کچھ دیر کے بعد وہ گھر کے اندر گیے اور روپیوں کی ایک گڈی لاکر ان کے ہاتھ میں دیدی۔ انھوں نے دیکھا تو وہ تین ہزار روپے تھے۔ انھوں نے بابو بھائی سے کہا کہ میں نے تو صرف دو ہزار روپئے کے لیے کہا تھا۔ بابو بھائی نے جواب دیا: آپ لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ رکھ لیجیے، شاید ضرورت پیش آجائے۔ بابو بھائی کے کچھ مسلمان کاریگروں نے رمضان کے آخری عشرہ میں روزہ چھوڑ دیا۔ بابو بھائی نے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ روزہ اور ڈیوٹی دونوں ساتھ ساتھ نہیں ہو پاتی۔ بابو بھائی نے ان لوگوں کو دس دن کی باتنخواہ رخصت دیدی۔ انھوں نے کہا کہ روزہ مت چھوڑو، خواہ کام چھوٹ جائے۔

انتقال سے صرف دو ماہ پہلے بابو بھائی مکہ گیے اور عمرہ کر کے واپس آئے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ " ۲۱ جولائی " کو ان کی روح قبض کی جانے والی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آخرت کے مقدس ترین مقام کی طرف لے جانے سے پہلے انھیں دنیا کے مقدس ترین مقام کی زیارت کرا دے۔

انتقال کے دن ۲۱ جولائی کو وہ فجر کے وقت بالکل ٹھیک حالت میں تھے۔ دن نکلنے کے

بعد اشراق کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک رکعت کے بعد مزید نماز ادا نہ کرسکے۔ عین حالت نماز میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے دو گھنٹہ بعد انتقال ہوگیا۔ کیسی عجیب تھی ان کی زندگی اور کیسی عجیب تھی ان کی موت۔

بابو بھائی مجھ سے عمر میں کم تھے اور صحت میں مجھ سے بہتر۔ اس لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر میرا خیال یہ تھا کہ پہلے میری باری آئے گی اور اس کے بعد بابو بھائی کی۔ مگر موت کم عمر اور زیادہ عمر کا فرق نہیں جانتی۔ وہ تندرست اور کمزور کے درمیان تمیز نہیں کرتی۔ وہ خود اپنے فیصلہ کے مطابق آتی ہے نہ کہ ہمارے اپنے اندازہ کے مطابق۔ اس طرح موت گویا ہر ایک کو یہ وارننگ دے رہی ہے کہ تیار رہو، ہر ایک جاگتے رہو۔ کیوں کہ کچھ نہیں معلوم کب کس کی باری آجائے۔

آخری دن ان کے مطالعہ میں ایک کتاب تھی جو آخرت کے موضوع پر تھی۔ "بک مارک" کے طور پر اس کے جس صفحہ پر نشان رکھا ہوا تھا وہ صفحہ وہ تھا جس میں اصحاب الجنۃ کا ذکر تھا ——— اللہ تعالیٰ انھیں جس آخری منزل کی طرف لے جا رہے تھے، یہ غالباً اس کی پیشگی خبر تھی جو انھیں اسی دنیا میں دی جا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں مرحوم کے درجات بلند کرے۔ اور ان کو جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ عطا فرمائے۔

موت کی خبر سننے کے بعد حیدرآباد سے چند بار ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد میں حیدرآباد جانے کے لیے باہر نکلا۔ اس وقت دہلی میں گرمی اتنی شدید تھی گویا آسمان سے آگ برس رہی ہو، گویا انسان کو آنے والی جہنم سے متعارف کرایا جا رہا ہو۔ محکمہ موسمیات کی اطلاع کے مطابق دہلی میں اس سال تقریباً سو سال کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ کیوں کہ سو سال سے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جولائی کا مہینہ گزر جائے اور مانسونی بارش نہ ہو۔

ایک طرف موسم کی یہ شدت اور دوسری طرف بابو بھائی جیسے نادر انسان کی موت کی خبر۔ میرا یہ حال ہوا کہ میں نے سوچا، اگر آسمان سے آواز آئے کہ آخری نیک انسان دنیا سے اٹھا لیا گیا، اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ قیامت کا طوفان لوگوں کے اوپر ٹوٹ پڑے، تو میں سمجھوں گا کہ وہ آخری نیک انسان شاید بابو بھائی تھے اور ان کے اٹھ جانے کے بعد اب دنیا کے اوپر خدا کے آخری فیصلہ کے ظہور میں کچھ دیر نہیں۔

ایمان

ایمان کسی تقلیدی عقیدہ کا نام نہیں۔ ایمان ایک زندہ شعور کا نام ہے۔ ایمان کے لفظی معنی اقرار کے ہیں۔ آدمی جب اللہ کو اس کی تمام صفات کمال کے ساتھ مانے اور اس کی تمام باتوں (وحی آخرت، ملائکہ وغیرہ) پر کامل یقین کر کے ان کی تصدیق کرے، وہ اللہ کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے تو اسی کا نام ایمان ہے۔

ان چیزوں کو ماننے کی ایک شکل یہ ہے کہ ان کو باپ دادا کی تقلید کے طور پر مان لیا جائے مگر اس قسم کا تقلیدی ایمان وہ ایمان نہیں ہے جو اللہ تعالےٰ کو مطلوب ہو۔ اس قسم کا ماننا بالکل بے روح ماننا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے ہاتھ میں چھنگلیا۔ چھنگلیا بظاہر انگلی کی مانند ہوتی ہے۔ مگر آدمی کے ہاتھ میں چھنگلیا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی فنکشن نہیں ہوتا۔ وہ ہاتھ کے ایک طرف بے کار لٹکی رہتی ہے۔ کچھ لوگ اس کو چھوڑے رکھتے ہیں اور کچھ لوگ اس کا آپریشن کرا دیتے ہیں۔

یہی معاملہ تقلیدی ایمان کا ہے۔ تقلیدی ایمان آدمی کی زندگی میں ایک بے اثر عقیدہ کے طور پر شامل رہتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا حاکم نہیں ہوتا۔ آدمی کی زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی الگ رہتی ہے اور اس کا ایمان الگ۔

حقیقی ایمان ایک قسم کا شعوری سفر ہے، وہ اس کا نام ہے کہ آدمی نہ دکھائی دینے والے خدا کو دیکھ لے۔ وہ غیب میں چھپی ہوئی حقیقت کا مشاہدہ کر لے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایمان ایک دریافت ہے۔ ایمان ایک ڈسکوری ہے، سب سے بڑی ڈسکوری۔ جو چیز آدمی کی زندگی میں بطور ڈسکوری کے داخل ہو اس کا داخل ہونا محض ایک سادہ چیز کا داخل ہونا نہیں ہوتا۔ وہ ایک

انقلاب ہوتا ہے ۔ وہ ایسا ہوتا ہے جیسے پُرسکون زمین میں زلزلہ آجائے ۔ یا ٹھہرے ہوئے پانی میں طوفان برپا ہوجائے ۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کو ملے تو وہ اس کی سوچ کو بدل دیتا ہے ۔ وہ اس کے مزاج کو بدل دیتا ہے ۔ وہ اس کی سرگرمیوں کے رخ کو پھیر کر ایک طرف سے دوسری طرف کر دیتا ہے ۔ اس کے بعد آدمی کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے ۔ اس کے بعد اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور کرتا ہے ۔ اس کے بعد آدمی وہ نہیں رہتا جو وہ پہلے تھا ۔ اپنے قول اور عمل دونوں کے اعتبار سے وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے ۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم قرآن سے کچھ واقعاتی مثالیں پیش کریں گے ۔

ایمان نیا انسان بناتا ہے

ایک مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کے جادوگروں کی ہے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا خدائی معجزہ سے بہت بڑا سانپ بن جاتا تھا ۔ مصر کے بادشاہ فرعون نے اس کے توڑ کے لیے اپنے ملک کے جادوگروں کو جمع کیا ۔ جادوگر جب آئے تو انہوں نے فرعون سے خوشامدانہ انداز میں کہا : اگر ہم موسیٰ پر فتح پالیں تو کیا ہمیں بادشاہ کی طرف سے کچھ انعام دیا جائے گا ۔ (اِئِنَّ لنا لاجراً ان کنا نحن الغالبین) (الشعراء ۴۰)

جادوگروں کا یہ حال اظہار حقیقت سے پہلے تھا ۔ اس کے بعد جب کھلے میدان میں ان کا مقابلہ حضرت موسیٰؑ سے ہوا اور جادوگروں نے دیکھا کہ ان کے سانپوں کو حضرت موسیٰؑ کے عصا نے نگل لیا ہے تو جادوگروں پر کھل گیا کہ حضرت موسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہیں ۔ اتنا بڑا واقعہ خدا کے پیغمبر ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ جادوگر اسی وقت خدا کے سامنے سجدے میں گر گیے ۔ وہ کہہ پڑے کہ آمنّا برب العالمین (ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے)

جادوگروں کا حضرت موسیٰؑ کے دین کو قبول کر لینا فرعون کے لیے ذاتی شکست تھی ۔ اس نے بگڑ کر کہا کہ میں تم کو سخت ترین سزا دوں گا ۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹواؤں گا ۔ اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا ۔ جادوگروں نے یہ سن کر کہا :

فاقض ما انت قاض انما تقضی ھٰذہ الحیاۃ الدنیا (جو کچھ تجھے کرنا ہے کر ڈال ،

تو جو کچھ کر سکتا ہے موجودہ دنیا کی زندگی میں ہی کر سکتا ہے۔ (طٰہٰ ۷۲)

اس مثال میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ ایمان کے بعد آدمی کے اندر کس طرح کا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ کس طرح اس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور (Emerge) کرتا ہے۔ وہی جادوگر جو چند لمحہ پہلے بادشاہ کی عظمت سے دبے ہوئے تھے، اور اس کی خوشامد کر رہے تھے، ایمانی انقلاب کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ وہ فرعون کی سخت ترین سزا کی دھمکی سن کر بھی متاثر نہیں ہوئے۔ باہر سے اگرچہ وہ پہلے ہی جیسے دکھائی دیتے تھے۔ مگر اب ان کے اندر ایک نیا انسان پیدا ہو چکا تھا۔ ایک ایسا انسان جو صرف خدا سے ڈرتا تھا، ایک ایسا انسان جس کی نظر میں آخرت کے سوا ہر چیز بے وقعت ہو چکی تھی۔

ایمان معرفت ہے

قرآن میں ایمان کو معرفت کہا گیا ہے (مما عرفوا من الحق، المائدہ ۸۳) اسی طرح حدیث میں ایمان کو علم کہا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ جس شخص نے جان لیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنت میں داخل ہوگا (من علم انہ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ، مسلم) معرفت اور علم کسی چیز کو شعوری طور پر پانے کا نام ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو شعوری طور پر پائے تو ایسا پانا محض بے اثر عقیدہ یا جامد نظریہ نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کے پورے وجود میں سما جاتا ہے۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔

اس قسم کے ایمان کا ایک واقعہ قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے۔ نجران کے علاقہ سے دس عیسائیوں کا ایک وفد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ آپ نے ان کو قرآن کے کچھ حصے سنائے۔ اس کو سن کر ان کے ذہن کی گرہیں کھل گئیں۔ انہوں نے خدا کو پہچان لیا۔ ان پر یہ منکشف ہوا کہ قرآن خدا کی کتاب ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اس انکشافِ حقیقت کے بعد ان کا جو حال ہوا وہ قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے: اور جب انہوں نے سنا اس کلام کو جو رسول کی طرف اترا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے، تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے (واذا سمعوا

آدمی کو لرزا دیتا ہے۔ خدا کی ہیبت سے اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آواز پست ہو جاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔ اس کی زندگی ایسی پابند زندگی بن جاتی ہے جیسے خدا اس کے رات اور دن کا نگراں بن گیا ہو۔

بعض مفسرین نے مومنین کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ غیب پر اس طرح یقین رکھتے ہیں جس طرح وہ مشاہدہ پر یقین رکھتے ہیں۔ (یومنون بالغیب کما یومنون بالشهادة) تفسیر ابن کثیر جلد اول، صفحہ ۴۱۔

گویا قیامت میں خدا کو دیکھ کر لوگوں کا جو حال ہوگا وہ حال مومن کا بغیر دیکھے ہوئے اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ غیر مومن قیامت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے، مومن اسی آج کی دنیا میں خدا کے سامنے ڈھ پڑتا ہے۔ قیامت میں خدا کے فرشتے لوگوں کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کریں گے مومن اسی دنیا میں اپنے آپ کو عدالت الٰہی کی ترازو میں کھڑا کر لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ غیر مومن پر قیامت میں گزرے گا وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔۔ اسی زلزلہ خیز تجربہ کا نام ایمان ہے۔

ایمان ایک اضافہ پذیر حقیقت ہے

سورہ ابراہیم میں ایمان اور مومن کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ کلمۂ ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ستھرا درخت۔ اس کی جڑ زمین میں قائم ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں (الم ترکیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء)

درخت کی ایک انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ بیج سے اکھوا، اکھوا سے تنہ، تنہ سے شاخیں، شاخوں سے پتیاں اور پھر پورا درخت۔ یہ خاص صفت جو درخت کو حاصل ہے یہی مومن کی بھی صفت اس دنیا میں ہوتی ہے۔ وہ ہر آن بڑھتا رہتا ہے۔ وہ بیج سے شروع ہو کر بڑھتے بڑھتے سرسبز درخت بن جاتا ہے۔

ایمان کس طرح بڑھتا ہے۔ اس کے بڑھنے کی صورت بھی وہی ہوتی ہے جو درخت کے بڑھنے کی صورت ہے۔ درخت زمین اور فضا سے معدنیات، گیسیں اور پانی لے کر اپنے وجود کو بڑھاتا

رہتا ہے۔ حتیٰ کہ فضا کی مضر گیس (کاربن) بھی اس کے خدائی کارخانہ میں داخل ہو کر اس کے وجود کا جزء بن جاتی ہے اور وہ مفید گیس (آکسیجن) کی صورت میں باہر نکلتی ہے۔ یہی مومن کا حال اس دنیا میں ہوتا ہے۔

مومن اپنے ماحول میں پیش آنے والے ہر واقعہ اور ہر مشاہدہ کو اپنے لیے غذا بناتا رہتا ہے۔ اس پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ فریاد کرنے کے بجائے صبر کرتا ہے۔ گویا مصیبت اس کے ایمانی کارخانہ میں داخل ہو کر مثبت نفسیات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح مومن کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو وہ فخر نہیں کرتا بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ گویا کہ جو چیز عام انسانوں کو خدا سے غفلت اور سرکشی کی طرف لے جاتی ہے وہ مومن کو خدا سے قریب کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ مومن کو اگر کسی سے شکایت ہوتی ہے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ گویا جو واقعہ عام انسان کو انتقام کی آگ میں جلانے کا باعث بنتا ہے۔ وہ مومن کو خدا کی رحمت کے سائے میں پہنچانے کا سبب بن جاتا ہے۔

اسی طرح مومن جب زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر یہ سب چیزیں خدا کی نشانیاں بن جاتی ہیں وہ مخلوقات کے آئینہ میں خالق کو دیکھ لیتا ہے۔ گویا جو مشاہدہ عام انسان کے لیے صرف مادی فائدہ یا Exploitation کا ذہن پیدا کرتا ہے وہ مومن کے ایمانی کارخانہ میں خدا کی یاد کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی طرح ہر معاملہ اور ہر مشاہدہ مومن کو ربانی غذا دیتا رہتا ہے اور اس کے ایمان و یقین میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے۔

ایمان ہر موقع پر اپنا پھل دیتا ہے

سورۂ ابراہیم کی مذکورہ آیت میں ایمان کو ستھرے درخت سے مثال دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ ہر موسم میں اپنا پھل دیتا ہے۔ (توتی اکلھا کل حین باذن ربھا)

پھل دار درخت کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اس کا موسم آتا ہے تو اس کی شاخوں پر پھل لٹکنے لگتے ہیں۔ مومن کا حال بھی اخلاق اور عمل کے دائرہ میں یہی ہوتا ہے۔ مومن کا زندہ شعور، اس کا خدا کو حاضر و ناظر جاننا، اس کا یہ یقین کہ مرنے کے بعد خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ چیزیں

مومن کو اتنا احساس اور اتنا ذمہ دار بنا دیتی ہیں کہ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کے ایمان کا تقاضا ہو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو اس سے وہی اخلاق اور کردار ظاہر ہوتا ہے جو خداوند ذوالجلال پر زندہ یقین رکھنے والے آدمی سے ظاہر ہونا چاہیے۔

جب اس کے سامنے کوئی سچائی ظاہر ہوتی ہے تو وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے دل سے اس کا اقرار کرلیتا ہے۔ جب خدا کی عبادت کی پکار بلند ہوتی ہے تو وہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر خدا کے آگے سجدے میں گر پڑتا ہے۔ جب اس کے مال میں سے خدا کا حصہ مانگا جاتا ہے تو وہ بلا تاخیر اس کو ادا کر دیتا ہے۔ جب کوئی حق دار اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ پورے انصاف کے ساتھ اس کو اس کا حق پہونچا دیتا ہے۔ جب وہ کسی سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا کیے بغیر اس کو چین نہیں آتا۔

اس طرح مومن کا ایمان ہر موقع پر ایک ربانی نوزین کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں ربانی کردار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر وہی کرتا ہے جو اس کو کرنا چاہیے۔ اور وہ نہیں کرتا جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔

ایمان ایک فکری انقلاب

ایمان کوئی جامد عقیدہ نہیں، ایمان ایک متحرک فکری سیلاب ہے۔ ایمان ایک ربانی چشمہ ہے جو کسی بندۂ خدا کے سینہ میں بہہ پڑتا ہے۔ ایمان یہ ہے کہ ایمان آدمی کو اس طرح ملے کہ وہی اس اس کی زندگی بن جائے۔ وہ ایسی روشنی ہو جس سے اس کا پورا وجود جگمگا اٹھے۔ وہ ایسا رنگ ہو جس میں آدمی کے سارے معاملات رنگے ہوئے نظر آئیں۔

ایمان خدا کی موجودگی کو پالینے کا نام ہے۔ ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمتوں میں گم ہو جائے، وہ احساس خداوندی میں نہا اٹھے۔ ایمان آدمی کے جذبات کا حمد خداوندی میں ڈھل جانا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا تعالے تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان ایک بھونچال ہے جو خدا کی معرفت سے آدمی کے اندر ابل پڑتا ہے۔ ایمان ایک دریا ہے جو خدا کے فیضان کو پاکر آدمی کے دل و دماغ میں جاری ہو جاتا ہے۔ ایمان خدا کو پالینا ہے، اور خدا کو پانا سب کچھ کو پالینا ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو اس کے بعد آدمی کو نہ ملے۔

حصّہ دوم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے :

قولوا اٰمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الیٰ ابراھیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ وما اوتی النبیون من ربّھم لانفرق بین احدٍ منھم ونحن لہ مسلمون۔ فان اٰمنوا بمثلِ ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولّوا فانما ھم فی شقاق فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم (البقرۃ ۱۳۶-۱۳۷)

کہدو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کلام پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتارا گیا۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو اللہ کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ پس اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو وہی ضد پر ہیں۔ اللہ تمہاری طرف سے ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مثل صحابہ ایمان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ میں اور اطراف مدینہ میں یہود آباد تھے۔ یہ آیت انہیں یہودیوں کے ذیل میں آئی ہے۔ یہ یہودی ان تاریخی نبیوں کو مانتے تھے جو پچھلے زمانہ میں ان کی نسل میں آئے اور جن کا ذکر ان کی کتاب بائبل میں موجود ہے۔ مگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کا انکار کرتے تھے جو ان یہودیوں کے اپنے زمانہ میں عرب میں پیدا ہوئے۔ اس کے برعکس صحابہ کرام کا حال یہ تھا کہ وہ تمام پیغمبروں کا اقرار کرتے تھے۔ اس پر کہا گیا کہ یہودی اگر صحابہ کی طرح مومن بنیں، وہ پچھلے پیغمبروں کو ماننے کے ساتھ وقت کے پیغمبر کو بھی مانیں تو وہ خدا کی نظر میں مومن ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دو قسم کا ہے۔ ایک مثل یہود ایمان۔ دوسرا مثل صحابہ ایمان۔

اللہ تعالیٰ کو مثل صحابہ ایمان مطلوب ہے۔ اس کو مثل یہود ایمان مطلوب نہیں ۔

اب دیکھئے کہ دونوں میں فرق کیا تھا۔ وہ فرق صرف فہرست کے مکمل ہونے یا نامکمل ہونے کا نہ تھا۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صحابہ کی فہرستِ انبیاء مکمل ہے اور یہود کی فہرست انبیاء نامکمل۔ یہ فرق حقیقت کا فرق تھا نہ کہ سادہ معنوں میں محض ظاہری فہرست کا۔

یہود حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ کو مانتے تھے۔ ان پیغمبروں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ گزرے ہوئے دور کے پیغمبر تھے۔ یہود کی قومی روایات میں ان کو عظمت کا مقام مل چکا تھا۔ ہر یہودی جو پیدا ہوتا وہ اول دن سے ان پیغمبروں کا نام اس حیثیت سے سنتا کہ وہ اس کی قوم کے عظیم بزرگوں میں سے تھے۔ وہ ان کو ابتدا ہی سے عظیم پیغمبر کی حیثیت سے جانتا تھا۔

اس کے برعکس محمد بن عبداللہ کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ کے یہود پہلی بار ان سے متعارف ہوئے تو اس طرح متعارف ہوئے کہ وہ اپنے وطن سے نکال دیئے گیے ہیں اور پناہ گزیں کے طور پر مدینہ پہونچے ہیں۔ پچھلے پیغمبروں کے نام کے ساتھ عظمت کی پُراسرار داستانیں شامل تھیں جب کہ محمد بن عبداللہ ان کو بس ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں کا پیغمبر ہونا یہود کی سمجھ میں آیا اور محمد بن عبداللہ کا پیغمبر ہونا ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ آپ کے بارے میں یہود کا پہلا تاثر ہی ان کے لیے آخری تاثر بن گیا۔

صحابہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے بھی اگرچہ آپ کو پہلی بار اسی روپ میں دیکھا جس روپ میں یہود نے آپ کو دیکھا تھا مگر صحابہ اس ظاہری مشاہدہ پر نہیں رکے بلکہ انہوں نے آپ کو اندر تک دیکھنے کی کوشش کی۔ یہود آپ کو ظاہر کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو آپ کے حال کے اعتبار سے دیکھ رہے تھے، صحابہ نے آپ کو آپ کے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ یہود آپ کو محمد بن عبداللہ کے روپ میں دیکھ رہے تھے صحابہ نے آپ کو محمد رسول اللہ کے روپ میں دیکھا۔

گویا کہ صحابہ نے جوہر شناسی کا ثبوت دیا اور یہود جوہر شناسی کا ثبوت دینے سے عاجز رہے صحابہ نے حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھا اور اس کو پہچان کر اس کا ساتھ دیا۔ جب کہ یہود نے

یہ ثابت کیا کہ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایک لفظ میں یہود کا کیس تقلید آبار کا کیس تھا اور صحابہ کرام کا کیس جوہر شناسی کا کیس۔ یہی وہ فرق ہے جس نے ایک گروہ کو اللہ کی نظر میں مومن ٹھہرایا اور دوسرا گروہ اللہ کی نظر میں غیر مومن ہو کر رہ گیا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ والا ایمان معرفت والا ایمان ہے۔ صحابہ نے مجرد سطح پر حقیقت کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ آج بھی وہی ایمان حقیقی ایمان ہے جو آدمی کے اندر مجرد سطح پر حقیقت کو دیکھنے کی نظر پیدا کر دے۔

یہ فرق بے حد بنیادی فرق ہے۔ اسی سے وہ تمام اعلیٰ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جو ہم صحابہ کرام کی زندگیوں میں دیکھتے ہیں۔

عبرت ونصیحت کا مزاج

ایک ایمان وہ ہے جو بس جامد عقیدہ ہو جو آدمی کے ذہنی اسٹور میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز کے طور پر پڑا ہوا ہو۔ وہ آدمی کی زندگی کا کل نہ ہو بلکہ وہ اس کا صرف ایک جزء ہو۔ دوسرا ایمان وہ ہے جو آدمی کے اندر اتنی گہرائی کے ساتھ اترے کہ وہی اس کی فکر و نظر بن جائے۔ آدمی ہر چیز کو اسی خاص زاویہ سے دیکھے۔ وہ ہر چیز میں اپنے ایمان کی جھلک پانے لگے۔ اس کا ایمان اس کا ایک جزء نہ ہو بلکہ وہی اس کا کل بن جائے۔

کوئی حقیقت جب گہرائی کے ساتھ کسی کو ملتی ہے تو وہ اس کی سوچ بن جاتی ہے۔ ایمان اسی قسم کی ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر کسی کے اندر داخل ہو اور وہ اس کی سوچ اور اس کے جذبات پر چھا نہ جائے۔

صحابہ کرام کا ایمان اسی قسم کا زندہ ایمان تھا۔ ان کا ایمان ان کے پورے فکر وخیال پر چھا گیا تھا۔ وہ ہر چیز میں اسی کا عکس دیکھنے لگے تھے۔ ہر چیز جو ان کی نگاہ سے گزرتی تھی وہ ان کے ایمان کے سانچہ میں ڈھل جاتی تھی۔ ہر مشاہدہ ان کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر ایمانی سبق کا ذریعہ بن جاتا تھا۔

ایک صحابی کا واقعہ ہے۔ وہ اپنے گھر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک گاڑی گزری جس میں دو جانور جتے ہوئے تھے۔ چلتے چلتے ایک جانور بیٹھ گیا اور دوسرا جانور کھڑا رہا۔ جو جانور

بیٹھ گیا تھا اس کو گاڑی والے نے ڈنڈے سے مارا۔ اس کو دیکھ کر صحابی نے کہا، اِنَّ فِی ھٰذَا لَمُعْتَبَرًا (اس کے اندر بھی نصیحت ہے) یعنی جو جانور چلتا رہا وہ بچ گیا اور جس جانور نے سستی دکھائی اس پر مار پڑی۔ یہی معاملہ انسان کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔ جو انسان خدا کی ڈیوٹی پوری کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو انسان خدا کی ڈیوٹی نہیں پوری کرے گا اس کو سزا ملے گی۔

گاڑی کا واقعہ بظاہر ایک دنیوی واقعہ تھا مگر صحابی نے اس دنیوی واقعہ میں آخرت کی جھلک دیکھ لی۔ ایک مادی مشاہدہ صحابی کے ذہنی خانہ میں داخل ہو کر روحانی واقعہ میں ڈھل گیا۔ اسی فکری تبدیلی کا دوسرا نام نصیحت ہے۔

اعتراف

موجودہ دنیا میں کسی آدمی کے لیے سب سے زیادہ مشکل چیز دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اتنا زیادہ گم رہتا ہے کہ اس کو دوسرے کی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ مگر ایک سچا مومن اس کمزوری سے پاک ہوتا ہے۔ ایمان درحقیقت خدا کی بڑائی کے مقابلہ میں اپنے عجز کی دریافت ہے۔ جب یہ ایمان کسی کو گہرائی کے ساتھ ملتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ذات اس کی نظر سے حذف ہو جاتی ہے۔ اس کا ایمان اس سے اس کی انا کو چھین لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے اندر اعتراف کا مادہ کمال درجہ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے کا اعتراف کرنے میں آدمی کی اپنی انا رکاوٹ بنتی ہے۔ جس شخص کی انا مٹ چکی ہو اس کے لیے کیا چیز ہوگی جو دوسرے کے فضل و کمال کا اعتراف کرنے میں رکاوٹ بنے۔

لبید ایک صحابی ہیں۔ وہ عرب کے ایک شاعر تھے۔ انہوں نے جب قرآن کو سنا تو وہ فوراً اس کے مومن بن گئے۔ اس کے بعد ان کی شاعری چھوٹ گئی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ نے شاعری کیوں چھوڑی تو انہوں نے کہا: اَبَعْدَ الْقُرْآن (کیا قرآن کے بعد بھی)

حضرت لبید کے اس جملہ کی اہمیت سمجھنے کے لیے ہم کو ۱۴ سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔ حضرت لبید نے یہ جملہ اس وقت کہا جب کہ قرآن ابھی اتر رہا تھا۔ جب قرآن کو ماننے والے مظلوم تھے۔ جب دنیا میں قرآن کی وہ عظمت قائم نہیں ہوئی تھی جو بعد کو پیش آنے والے تاریخی واقعات کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔ اس وقت یہ کہنا کہ "کیا قرآن کے بعد بھی" ایک بے حد

مشکل کام تھا۔ اس کے لیے صحابہ والا ایمان درکار تھا جو آدمی کی خودی کو اس سے چھین لے تاکہ وہ اپنی ذات کے باہر کی حقیقتوں کو کھلے طور پر دیکھنے لگے۔

خدا کی نسبت سے دیکھنا

حضرت ابو مسعود ایک صحابی تھے۔ ایک بار وہ اپنے غلام پر خفا ہو گئے اور اس کو ڈنڈے سے مارنے لگے۔ اتفاق سے اسی وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر اس طرف سے ہوا۔ آپ نے دیکھا کہ ابو مسعود اپنے غلام کو مار رہے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا: اعلم ابامسعود ان اللہ اقدر علیک منک علی ھذا الغلام۔ (اے ابو مسعود، جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اس غلام کے اوپر قادر ہو) حضرت ابو مسعود نے جب اس تنبیہ کو سنا تو ان کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ شخص جو اس سے پہلے اپنے غلام کو مار رہا تھا، اس کے بعد کیوں ایسا ہوا کہ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو مسعود معاملہ کو پہلے بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے۔ اب اس یاددہانی کے بعد وہ معاملے کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھنے لگے۔

جب وہ معاملے کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھ رہے تھے تو وہ اپنے اور غلام کے درمیان فرق پا رہے تھے ——— میں مالک ہوں اور وہ ملازم، میں طاقت ور ہوں اور وہ کمزور، میں امیر ہوں اور وہ غریب، میں صاحب حیثیت ہوں اور وہ بے حیثیت۔ مگر جب یہ ذہن ختم ہوا اور انہوں نے معاملہ کو خدا اور بندے کی نسبت سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں اور غلام میں کوئی فرق نہیں۔ اب انہوں نے اپنے آپ کو بھی وہیں کھڑا ہوا پایا جہاں انہوں نے اس سے پہلے اپنے غلام کو کھڑا کر رکھا تھا۔ کیونکہ خدا کے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انسانوں کے درمیان ہمیشہ فرق ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاملہ کو بندے اور بندے کی نسبت سے دیکھا جائے تو ایک اور دوسرے کے درمیان فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہی فرق تمام ظلم اور فساد کا سبب ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو بڑا محسوس کرتا ہے وہ چھوٹے اور کمزور پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ لیکن اگر معاملات کو خدا اور بندے کی نظر سے دیکھا جانے لگے تو سارا فرق مٹ جائے

گا۔ کیوں کہ خدا کی نظر میں سب حقیر اور کمزور ہیں۔ یہ ذہن خود بخود ظلم و زیادتی کے مزاج کو چھین لیتا ہے۔

صحابہ کرام کا حال یہی تھا۔ وہ ہر معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھتے تھے۔ وہ انسان کی طرف بڑھتے ہوئے سمجھتے تھے کہ وہ خدا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاتھ ہر ظلم سے رکے رہتے تھے۔ ان کا قدم زیادتی کی طرف بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ ہر انسان کے ساتھ اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کا ایمان بھی اسی وقت ایمان ہے جب کہ وہ اس قسم کا زندہ ایمان بن جائے۔ جب ان کے اوپر خدا کی عظمت اس طرح چھا جائے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو اس کے زیر اثر محسوس کرنے لگیں۔ جب بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے بھی وہ یہ سوچ کر سنبھل جائیں کہ وہ خدا سے معاملہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ بندہ کمزور ہے مگر خدا تو کمزور نہیں۔

انتقام نہیں

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوہ بنی المصطلق کہتے ہیں۔ یہ غزوہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس غزوہ کے بعد ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنا کر مدینہ کے منافقین نے حضرت عائشہ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ بعد کو قرآن (سورہ نور) میں آیت اتری جس نے حضرت عائشہ کی کامل برأت کر دی۔

اس وقت مدینہ میں ایک مہاجر مسلمان تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ وہ بھی منافقوں کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس الزام میں شریک ہو گئے۔ مسطح حضرت ابو بکر کے دور کے عزیز تھے۔ ان کی غربت کی وجہ سے حضرت ابو بکر ہر ماہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ حضرت ابو بکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر ان کو اس واقعہ کے بعد مسطح سے سخت شکایت ہو گئی۔ مسطح کے اس فعل کے بعد حضرت ابو بکر نے قسم کھائی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری کہ ۔۔ تم میں جو لوگ وسعت والے ہیں ان کو نہیں چاہیے کہ وہ قسم کھالیں کہ وہ مسکینوں کی مدد نہیں کریں گے۔ بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے۔ اور اللہ بہت معاف کرنے

والا مہربان ہے (ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم)
حضرت ابوبکر نے اس آیت کے بعد کہا: بلیٰ واللہ انی لاحب ان یغفر اللہ لی (ہاں خدا کی قسم میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے) اور مسطح کو جو اعانت وہ دیا کرتے تھے اس کو دوبارہ جاری کر دیا۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق اس میں اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ذاتی شکایت کے معاملہ میں صحابہ کا طریقہ کیا تھا۔ ان کی شکایت کبھی نفرت اور انتقام کی اس حد تک نہیں پہونچتی تھی جو دل سے نکل ہی نہ سکے۔ اور نہ ایسا ہوتا تھا کہ شکایت پیدا ہونے کے بعد وہ شکایت والے آدمی کے لیے ظالم بن جائیں۔ اور اس کے خلاف ہر کارروائی کو اپنے لیے جائز سمجھ لیں۔ صحابہ کرام ہر معاملے کو آخرت کے لحاظ سے دیکھتے تھے۔ وہ دوسروں کے قصور کو معاف کرتے تھے تاکہ خدا ان کے قصور کو معاف کرے۔ وہ دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرتے تھے تاکہ خدا ان کی کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ آخرت کا مسئلہ ان کے ذہن پر اتنی شدت سے چھایا ہوا تھا کہ اس کے مقابلہ میں دوسرا ہر مسئلہ انہیں ہلکا نظر آتا تھا۔ وہ آخرت کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتے تھے۔ وہ آخرت کی خاطر ہر رنج کو بھلا دیتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکے کہ انہوں نے برائی کے بدلے بھلائی کا سلوک کیا۔ انہوں نے تکلیف پہونچانے والوں کو دعائیں دیں۔ جنہوں نے ان کو ستایا ان کے لیے وہ رحمت کا چشمہ بن گئے۔ یہی ایمان مثل صحابہ ایمان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو جو ایمان مطلوب ہے وہ وہی ہے جو مثل صحابہ ایمان ہو۔ جس شخص کو یہ تمنا ہو کہ آخرت میں خدا اس کے ایمان کو قبول کرے اس کو چاہیے کہ وہ صحابہ کے نمونے کو پکڑے۔ وہ صحابہ کے طریقہ کی پیروی کرے۔ وہ ایمان کے معاملے میں صحابہ کی تقلید کرنے والا بن جائے۔

ہر حال میں انصاف

عبدالرحمٰن بن عوف ایک صحابی تھے۔ اور حضرت خالد بن ولید بھی ایک صحابی تھے۔ دونوں کے درمیان کسی دنیوی معاملہ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ شکایت اتنی بڑھی کہ وہ عرصہ تک ختم نہ ہو سکی۔

اس درمیان میں ایک شخص حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آیا۔ اس نے ان کو خوش

کرنے کے لیے حضرت خالد کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس نے یہ تاثر دینا چاہا کہ حضرت خالد دینی اعتبار سے کمزور ہیں۔ ان کا اسلام زیادہ قابلِ اعتماد نہیں۔ یہ سن کر حضرت عبد الرحمٰن بن عوف سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے مذکورہ آدمی سے کہا: مه فان ما بيننا لم يبلغ ديننا۔ (دور ہو، ہمارے اور ان کے درمیان جو بات ہے وہ ہم دونوں کے دین تک نہیں پہنچے گی) یعنی ہمارے اور ان کے درمیان دنیا کے معاملہ میں جو شکایت ہے اس کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے کے اسلام کو ناپنے لگیں۔ اس کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کو دینی حیثیت سے بُرا کہنے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا مزاج یہ تھا کہ اگر کسی شخص سے ایک معاملے میں شکایت پیدا ہو جائے تو اس کو بس اسی معاملہ تک محدود رکھا جائے۔ ایک معاملہ کی شکایت کو لے کر آدمی کو ہر معاملہ میں کنڈم نہ کیا جائے۔ وہ قرآن کی اس ہدایت کے سختی سے پابند تھے کہ: ولا يجرمنكم شنان قوم على الّا تعتدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوىٰ (المائدہ ۸) یعنی کسی کی دشمنی تمہیں یہاں تک نہ لے جائے کہ تم اس کے ساتھ انصاف نہ کرو۔ بلکہ دشمن کے ساتھ بھی انصاف کرو۔ یہی راستہ تقویٰ سے قریب ہے۔

یہ ایمانی طریقہ جو صحابہ کرام کا تھا یہی عام مسلمانوں کو بھی اختیار کرنا ہے۔

خلاصہ

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے مطابق ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مثلِ یہود ایمان اور دوسرا مثلِ صحابہ ایمان۔ مثلِ یہود ایمان دوسرے لفظوں میں نسلی اور تقلیدی ایمان ہے۔ وہ جامد پتھر کی مانند ہے جس میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ اس سے کردار اور عمل کی شاخیں نہیں پھوٹتیں۔ اس سے روحانی ترقی کے چشمے جاری نہیں ہوتے۔ ایسا ایمان آدمی کی دل کی گہرائیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ ایسا ایمان الگ رہتا ہے اور آدمی کی زندگی الگ۔

اس کے برعکس مثلِ صحابہ ایمان ایک معرفت ہے۔ وہ ایک ڈسکوری ہے۔ وہ ایک فکری انقلاب ہے۔ جب کسی آدمی کے اندر یہ ایمان پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کے پورے وجود کو ہلا دیتا ہے۔ اس کی ہستی خدا کے نور میں نہا اٹھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے سوچنے

اور عمل کرنے کی پوری دنیا بدل جاتی ہے۔ وہ ظاہری چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے لگتا ہے۔ گرد و پیش کی ہر چیز اس کے ایمان کی غذا بن جاتی ہے۔ ایمان اس کے لیے اتنی بڑی چیز ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہر چیز اس کی نظر میں چھوٹی ہو جاتی ہے۔ وہ نفرت اور انتقام کی نفسیات سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کا ایمان اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہے۔ وہ کبھی صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔

دہلی، یکم جولائی ۱۹۸۵

موجودہ حالات کے بارہ میں الرسالہ کا نقطۂ نظر خدا کے فضل سے عام ہو رہا ہے۔ روزانہ اس کی نئی مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی روزنامہ ٹیلی گراف (۱۰ جون ۱۹۸۷) نے صدر اسلامی مرکز کی ایک تحریر نمایاں طور پر شائع کی ہے۔ اور اس کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے: Cure for communalism.

اسی طرح ہفت روزہ نئی دنیا (۲۹ جون ۱۹۸۷) کے ایڈیٹر نے مولانا وحید الدین خاں کی ایک تحریر مکمل طور پر نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ تحریر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس تحریر میں کہا گیا تھا کہ موجودہ مسائل کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان موجودہ نزاع کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔ ایڈیٹر نئی دنیا نے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جو قائدین مسلمانوں کی لاشوں پر اپنی سیاست چمکانا چاہتے ہیں وہ اس حکمتِ عملی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسے ناقابل عمل اور بزدلانہ قرار دیتے ہیں۔ موجودہ غم و غصہ کے ماحول میں جب کہ مسلمانوں کا دل غم سے چور ہو چکا ہے، جذباتی اور ٹکراؤ کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ ان حالات میں عوام کا ایک طبقہ گفتار کے غازی قائدین کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اور دور اندیشی سے مستقبل کی تعمیر کی صلاح دینے والوں کو گالیوں سے نوازتا ہے۔ لیکن تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آخر کار عوام کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون انھیں تباہی اور بربادی کے دلدل میں لے جا رہا ہے اور کون ہوش اور دانش مندی سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے دلدل سے بچ کر گزرنے کی راہ دکھا رہا ہے۔"

الرسالہ انگریزی کے ذریعہ ہماری آواز تیزی سے ملک کے اعلیٰ طبقہ تک پہنچ رہی ہے۔ مثلاً ہم کو انگریزی روزنامہ نادرن انڈیا پتریکا کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر تمل کانتی گھوش کا خط (۲۷ جون ۱۹۸۷) الٰہ آباد سے موصول ہوا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انھیں الرسالہ انگریزی کا جون ۱۹۸۷ کا اشو ملا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے اس کو بہت پسند کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ اس کو مستقل طور پر اپنے مطالعہ میں رکھیں۔ اس لیے انھیں ہر ماہ انگریزی الرسالہ پابندی کے ساتھ روانہ کیا جائے۔

۴۔ انگلینڈ سے مسٹر ایڈورڈ وٹنر (Edward Witners) نے اپنے خط (۲۵ جون ۱۹۸۷) میں الرسالہ انگریزی کے بارہ میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور دو سال کا زر تعاون بھیجتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نام پابندی کے ساتھ الرسالہ انگریزی جاری رکھا جائے۔

۵۔ روزنامہ انقلاب میں مسٹر متر ستیارتھی نے "خاتون اسلام" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت ہندستانی مسلمانوں کے آئندہ سنہرے دور کی ضمانت ہے۔ ان کا الرسالہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے جس کے ہم ایسے کافر بھی مستقل قاری ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب جس کا نام انھوں نے خاتونِ اسلام رکھا ہے، ہم ہندستانیوں کے ذہنوں پر جو مغربی کلچر کا احساس برتری چھایا ہوا ہے، اس احساس برتری کے قفل پر موصوف کی یہ تصنیف بھرپور طاقت سے چلایا ہوا ایک ہتھوڑا ثابت ہوئی ہے" تفصیلی تبصرہ انقلاب (۹ مئی ۱۹۸۷) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۶۔ ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے صدر اسلامی مرکز نے افریقہ کا سفر کیا۔ یہ سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ اس کی مفصل روداد آئندہ کسی شمارہ میں انشاء اللہ شائع کر دی جائے گی۔

۷۔ میرٹھ کے حالات جاننے کے لیے صدر اسلامی مرکز نے ایک وفد کے ساتھ ۲۸ جون ۱۹۸۷ کو میرٹھ کا سفر کیا۔ اس سفر کے تاثرات اور مشاہدات انشاء اللہ آئندہ شائع کیے جائیں گے۔

۸۔ مندر مارگ (نئی دہلی) میں ۹ مئی ۱۹۸۷ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے قرآن کا درس دیا۔ درس کا موضوع "نماز" تھا۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں نماز کی اہمیت واضح کی گئی۔

۹۔ بعض مقامات پر یہ سوچ ابھری ہے کہ موجودہ فسادات کی اصل جڑ لوگوں کی بے شعوری ہے۔ ان فسادات کو ختم کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مسلمانوں کی بے شعوری کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ان مقامات پر یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلایا جائے تاکہ لوگ باشعور بنیں۔ یہ نہایت صحت مند رجحان ہے۔ فساد کی جڑ اسی طرح کٹ سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر جگہ یہی کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الرسالہ پڑھایا جائے۔

۱۰۔ فسادات کا سلسلہ ختم کرنے کے لیے ایک بنیادی تجویز یہ ہے کہ ایک جیپ حاصل کی جائے اس میں لاؤڈ اسپیکر نصب ہو۔ اور اسی کے ساتھ ضروری تعمیری لٹریچر بھی موجود ہو۔ جیپ کے ذریعہ چند صالح مزاج کے آدمی بستیوں بستیوں کا سفر کریں اور ہر جگہ جاکر لوگوں کو سمجھائیں اور ان کے اندر تعمیری شعور پیدا کریں۔ اس اسکیم کے سلسلہ میں جو لوگ اپنا تعاون دینا چاہیں وہ مطلع فرمائیں۔

۱۱۔ عرب ملکوں میں باہر کے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں اور ان کے درمیان دعوتی کام کے زبردست مواقع ہیں۔ کئی عرب ملکوں سے اس قسم کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ مثلاً ایک عرب ملک میں وہاں کے عرب نوجوان جو کمپنیوں میں کام کرتے ہیں وہ اپنی کمپنیوں میں کام کرنے والے مغربی افراد تک انگریزی الرسالہ پہنچا رہے ہیں جن کو وہ بڑے شوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

۱۲۔ ایک عرب ملک سے ایک صاحب ایجنسی لکھتے ہیں: "انگلش الرسالہ یہاں الحمدللہ یوروپین افسران بڑی دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ ان کے درمیان انگریزی الرسالہ دن بدن مقبول ہوتا جارہا ہے" انھوں نے انگریزی الرسالہ کی تعداد میں اضافہ کے لیے تحریر فرمایا ہے۔

۱۳۔ ایک صاحب گلبرگہ سے لکھتے ہیں "ماہنامہ الرسالہ کا مطالعہ پابندی سے ہو رہا ہے۔ یہاں کثرت سے لوگوں کے ہاتھوں میں الرسالہ نظر آتا ہے۔ ماضی اور حال کا جائزہ لینے کے بعد یہی اندازہ ہو رہا ہے کہ الرسالہ کا مستقبل بہت ہی زیادہ روشن ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ الرسالہ سے اپنی تمام اندرونی برائیوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور زندگی کی اندھیریوں میں ہمارے لیے الرسالہ ایک شمع کی مثال رکھتا ہے (غیاث رشادی)

۱۴۔ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے آپ کی کتاب تجدید دین کا گہرا مطالعہ کیا۔ واقعی یہ دین کی تجدید کرتی ہے۔ وہ تمام خیالات جو دین میں رخنہ پیدا کرتے ہیں، اس کے مطالعہ سے دور ہوجاتے ہیں اور دین کا صحیح مفہوم دماغ میں آجاتا ہے۔ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے وسیع النظری کی ضرورت ہے، کوتاہ ذہن اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں نے تذکیر القرآن کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا ہے۔ موجودہ سائنسی دور کے لیے یہ بہترین تفسیر ہے۔ (عزیز احمد خاں ایڈوکیٹ، سکندر آباد)

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

D(SE) 243 R.N. No. 28822/76 September 1987 No 130



ISLAMIC LITERATURE

In Contemporary Idiom
by Maulana Wahiddudin Khan

Our publications aim at presenting Islamic teachings in contemporary scientific idiom. Apart from over 60 books in Urdu, English, Arabic and Hindi, we publish two thought-provoking monthly magazines entitled *AL-RISALA* in Urdu and English.



Monthly *AL-RISALA* has two-fold aim: to introduce Islam as a divine message to all mankind: and to promote a positive and constructive thinking among the people.

Annual subscription: Rs. 48 (inland);
US $ 25 (abroad by airmail);
US $ 10 (by surface mail)

AL-RISALA CASSETTE

This series of lectures and talks recorded on cassettes aims at creating a spiritual awareness and stimulating constructive thinking.

Price per Cassette:
Rs. 25, US $ 5.

THE ISLAMIC CENTRE
C-29 Nizamuddin West,
New Delhi - 110013 (India)
Tel. 611128, 697333

Rs. 4